U33514 P - 26-1209

Title - TEHQEEQI NAWADIR.

Creator - Aamna Khatoon

Publisher - Kauskar Press (Bangalore)

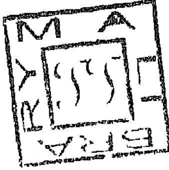
Date - 1949

Pages - 180

Subjects - Urdu Adab - Tehqeeq-o-Tanqeed; Insha Allah Khan Insha - Auhad-o-Muaasreen
Kaifi - Dariya-e-Lataafat; Khawateen - Urdu
Dastoor Al Fasahat; Akbar Allahabadi -

۷۸۶

تحقیقی نوادر



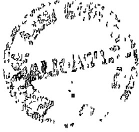
از

آمنہ خاتون ایم اے

لکچرر مہارانی کالج میسور

کوثر پریس (بکڈپو) معسکر بنگلور





بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

میرے بزرگوں کا وطن شہر میسور ہے اور پیشہ تجارت۔ ۶/ اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء میری تاریخ پیدائش ہے۔ میں نے سنہ ۱۹۴۱ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس میں میرے اختیاری مضمون فارسی، تاریخ ہند و یورپ اور عمرانیات تھے۔ اسی سال جامعۂ میسور میں استاذی و مخدومی آقا محمد عباس شوستری سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی کی سعیٔ مشکور سے پہلے پہل اردو آنرز کی جماعت کا اجرا ہوا۔ اردو کی خدمت گزاروں میں شمار ہونے کا مجھے جبلی ذوق تھا سو میں بھی اس جماعت میں داخل ہو گئی۔ ۹/ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں جناب عبدالقادر صاحب سروری حیدرآبادی اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے۔ آپ کا تعلق جامعۂ میسور سے چھ سال سنہ ۱۹۴۸ء کے وسط تک رہا۔ میں سنہ ۱۹۴۳ء میں اردو آنرز اور سنہ ۱۹۴۴ء میں ایم۔ اے میں اوّل درجے میں کامیاب ہوئی۔ اور گزشتہ چار برس سے یہاں کے زنانہ کالج "مہارانیس فسٹ گریڈ کالج فار ویمن" میں اردو اور فارسی کی لکچرر کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ میرے شوہر مولوی محمد خاں صاحب بھی مہاراجا کالج میسور میں اردو و فارسی کے لکچرر ہیں۔

میں نے ایم۔ اے میں کسی ایک موضوع ' پر مقالہ لکھنے کی بجائے چار مضامین پر امتحان دیا

پہلا پرچہ — تاریخ زبان و ادب اردو ،

دوسرا پرچہ — دکنی لٹریچر سنہ ۱۷۵۰ء تک

تیسرا پرچہ — اردو شاعری سنہ ۱۷۵۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک ،

ب

چوتھا پرچہ ایک مخصوص شاعر "A Special author"

اور آخری پرچے کے لئے سید انشاء اللہ خاں انشا کا انتخاب کیا تقریباً آٹھ برس سے انشا کے متعلق میں اپنی تحقیقات قلمبند کرتی جا رہی ہوں۔ اس کا اکثر حصہ انشا کی عدیم النظیر تصنیف دریائے لطافت پر مبنی ہے۔ پیش نظر مضمون اسی خرمن کے چند خوشے ہیں جن کی بالیدگی تازگی، اور فائدہ مندی اس وقت تک معتبر نہیں ہو سکتی جب تک کہ اردو زبان و ادب کے صاحب نظروں کی سند حاصل نہ کر لیں۔ "دریائے لطافت" میں صرف و نحو پر جو ابواب ہیں انہیں میں نے اس طرح مرتب کرنا شروع کیا کہ ایک ایک بحث کے متعلق پہلے اس امر کا مطالعہ کیا کہ انشا کے زمانے سے لے کر آج تک اس بحث میں کیا کیا ترمیمات اور اضافے ہوئے ہیں اور پھر کسی موضوع کے بارے میں میری اپنی رائے کیا ہے "خلاصہ تقدیر فعل" ص ۲۳ کے مطالعے سے میری کوششوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری یہ تلاش ان کل ماخذوں پر حاوی نہیں ہے جو اس موضوع پر ہندوستان میں مہیا ہو سکتے ہیں۔ ایک خاتون کے لئے سفر کی مشکلات اور میسور میں اردو زبان و ادب کی کتابوں کی نایابی میری کوتاہیوں کا معقول عذر ہو سکتی ہے۔ جو معلومات مجھے میسر ہو سکی ہے اس سے صحیح یا منطقی ترتیب نتائج کے استنباط میں مجھ سے اگر ایسی لغزشیں ہوئی ہیں جو میرے اکتسابات کے مقابلے میں بہت ہی پست اور حیرت انگیز ہیں تو مجھے کوئی مغالطہ انگیز داد بھی نہ ملنی چاہیئے۔

ڈرتے ڈرتے میں نے چند تحقیقات پہلے مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی خدمت میں بھیجیں انھوں نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۸ جون سنہ ۴۵ء میں تحریر فرمایا کہ "آپ کے بھیجے ہوئے اوراق میں نے پڑھے۔ بہت ہی خوش ہوا کہ ایک ایسے خشک مضمون سے آپ کو دلچسپی ہے اور اس میں آپ کی نظر گہری ہے" اس جملے نے میرا دل بڑھایا پھر میں نے

اپنی کئی تحقیقات ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمت میں بھیجیں اور آپ کے گراں بہا اوقات میں مخل ہونے کی ہمت کی اور بمصداق

ع کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

ابھی دو مہینہ پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے دریافت کیا تھا کہ میری یہ سعی پی ایچ ڈی کی سند کے لیے پیش ہو سکتی ہے یا نہیں۔ آپ نے مشورہ دیا کہ "آپ علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کریں .... یہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ آپ جیسے لطافت پر کام کریں وہی آپ کا مقالہ فضیلت قرار پا سکتا ہے۔ (مکتوب مورخہ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء)

اس مجموعے کا نام "تحقیقی نوادر" ڈاکٹر صاحب موصوف کا عطیہ ہے اور اس کی طباعت کا مقصد یہ ہے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میری تنقیدی اور ادبی صلاحیتوں کے بارے میں دیدہ ور نقادوں کی آراء سے مستفید ہو سکوں اور انشا پرداز تک جو ظلم ہو رہے ہیں، میں ان کی تلافی زیادہ یقین، زیادہ صداقت، زیادہ خلوص اور زیادہ انصاف کے ساتھ کر سکوں۔ یہ مجموعہ عیار طبع خریدار دیکھ کر متاع سخن کے ساتھ بکھ جانے کے لئے طبع نہیں کیا گیا، بلکہ محض اس لئے کہ خواص کے ان مول مشوروں کی بدولت میں اپنا مقالہ مخدومی صدیقی صاحب کی توقع کے مطابق لکھ سکوں کہ "اردو زبان پر کام کرنے والوں کے لئے آپ کی کتاب بہت بیش بہا ہوگی"۔ (مکتوب مورخہ ۲۹ اگست سنہ ۴۹ء) اس مجموعے کی اشاعت صرف خواص تک محدود ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کی قدر دانیوں اور کرم فرمائیوں کا میں نہایت ممنون ہوں، "دستور الفصاحت" پر میری تنقید آپ ہی کے ایما سے "برہان" میں شائع ہوئی۔

"آپ نے دستور الفصاحت پر جس مہربانی اور لیاقت اور استعداد سے نظر ڈالی ہے اس کا شکریہ پھر ادا کرتا ہوں، اگرچہ مجھے اب بھی بعض باتوں میں اختلاف ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک سیر حاصل مضمون اس پر لکھ کر مجھے بھیج دیں میں اسے معارف یا برہان یا اردو میں اشاعت کے لیے بھیج دوں گا ... . میرا دل کسی طرح گوارا نہیں کرتا کہ آپ کی اتنی محنت پردۂ خفا میں رہے" (مکتوب مورخہ ۱۴ اکتوبر سنہ ۴۶ء)

"آپ نے جس محنت اور دیدہ ریزی سے اس تبصرے کو لکھا ہے اس کی قدر و قیمت اور کوئی جانے یا نہ جانے میں خوب جانتا پہچانتا ہوں، آخر میرا کام یہی دن رات کا ہے"
(مکتوب مورخہ ۱۵ جنوری سنہ ۴۷ء)۔

"میں نے آپ کا تبصرہ رسالہ برہان دہلی کو بھیج دیا تھا .... مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم، اے، مدیر برہان نے آپ کے متعلق جو لکھا ہے اس کے جستہ جستہ فقرے سنانے کو دل چاہا .... اچھا اب ان کی سنئے :۔

"مقالہ دیکھ کر بڑی مسرت اس احساس سے ہوئی کہ ہمارے ملک میں اور خصوصاً مسلمان خواتین میں افسانہ نگار اور ادب لطیف پر خامہ فرسائی کرنے والی ہی نہیں ہیں بلکہ ایسی بھی ہیں جو ایک مشہور ادبی کارنامے پر سنجیدہ اور متین تنقید بھی کر سکتی ہیں، کثر اللہ امثالہا"
(مکتوب مورخہ ۴ فروری سنہ ۴۷ء)۔

مولانا عرشی صاحب "انشا" کی تالیف کے سلسلے میں کئی مفید مشورے دیتے اور نایاب حوالے نقل کرا کے بھجواتے آئے ہیں، آئندہ سال علی گڑھ میں میرے قیام کے زمانے میں آپ سے مزید عنایات کی توقع ہے۔

اسی سال مئی کے آخری ہفتے میں محترمی پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو

علی گڑھ اور پروفیسر آل احمد صاحب سرور میسور آئے تھے، ۲۹ مئی کو میرے گھر بھی از راہِ ذرہ نوازی و علم پروری تشریف لائے، "انشا" سے متعلق مسودے دیکھے اور فرمایا کہ شمالی ہند کے دو شاعروں کے سیر حاصل حالات کی تدوین دو جنوبی ہند کے طالب علموں کی قسمت میں لکھی تھی، شیخ چاند مرحوم نے "سودا" پر مقالہ لکھا تھا اور اب آپ "انشا" پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی تھی جو محترم جناب سید صاحب سے تفصیلی بالمشافہ گفتگو کا موقع نصیب ہوا۔ آپ کی ہدایتوں نے مجھے یقین دلایا کہ "انشا" کی تالیف اور اس کی اشاعت سے میں اپنی عمرِ عزیز کو رائگاں اور قارئین کے لمحاتِ فرصت کی بے قدری نہیں کر رہی ہوں۔

سطورِ بالا میں "انشا" کی تالیف کے متعلق جن ادیبوں اور نقادوں کی رائے کا ذکر کیا ہے اس سے میری غرض تبصرہ نگاروں کو متاثر کرنا کیوں کر ہو سکتی ہے۔ میں نے جن خاص خاص ادیبوں اور نقادوں کی خدمتوں میں یہ مجموعہ ارسال کیا ہے ان کے بارے میں اگر میرے دماغ میں اس خیال کا شائبہ تک آئے تو یہ میری ادبی تنگ نگاہی اور کم حوصلگی کا ثبوت ہوگا، حاشا و کلا، اس انفرادیت اور شخصیت کو جو حق بات کہنے میں دوسروں کے مقابلے میں مٹ جاتی ہے یا کم سے کم دب جاتی ہے کسی کی رہبری کرنے کا کوئی حق بھی نہیں، و خویشتن گم است الخ۔ اب اگر کوئی مبصر ڈاکٹر صدیقی یا پروفیسر رشی یا مولانا عرشی سے اتفاق کریں گے، تو اس لئے کہ رائے میں توارد ہوتا ہے اور اگر مخالفت ہوگی تو کسی پس منظر کے بغیر اور سب سے الگ۔

علامہ حضرت کیفی دہلوی کے ترجمہ دریائے لطافت پر میرے تبصرہ کا شائع ہونا دریائے لطافت کی بقا کے لئے ناگزیر تھا، شہرت طلبی یا خردہ گیری منظور نہیں، اہلِ فن نے

سے پہلے ایک جامع مقدمے میں میں نے اس کی اشاعت کے وجوہ بیان کیے ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ مجھ پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا، قارئین کرام سے التماس ہے کہ اس سلسلے میں اس مجموعے کے صفحہ ۱۲۱ اور صفحہ ۱۲۷ پر کے آخری پیراگراف ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو مئی سنہ ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں بنگلور آئے تھے، مجھے اللہ نے یہ سعادت بخشی کہ آپ سے نیاز حاصل ہوا آپ نے میری تالیف کے مسودے دیکھے۔ انشا سے متعلق اس مجموعے میں جو مضمون ہیں انہیں آپ نے ملاحظہ نہیں کیا، یہ اس وقت مسودوں کی حالت میں تھے۔ "مصطلحاتِ دہلی" کو (دروازۂ چہارم پنجم دریائے لطافت از صـ۲۳ تا صـ۱۰۵) اس وقت میں نے حروف تہجی کی رعایت اور حواشی کے ساتھ مرتب کر لیا تھا، مولوی صاحب نے اس کو بہت پسند فرمایا۔

اس مجموعے کے کل گیارہ مضامین میں سے چھ مضمون پہلے شایع ہو چکے ہیں، پہلا، چوتھا، ساتواں، نواں، دسواں، گیارہواں۔ دو مضمون پہلا اور آخری یہاں کے ریڈیو اسٹیشن "آکاش وانی" سے نشر ہوئے تھے۔ یہ بہت مقبول ہوئے اور ہماری زبان، زمیندار، حریت وغیرہ اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئے۔

مجھے اللہ جل شانہ سے امید واثق ہے کہ میں نے جن مقتدر و مستند ادیبوں اور نقادوں کی خدمت میں یہ مجموعہ بھیجا ہے وہ اپنی ان مول رائے سے میری رہبری میں کچھ دریغ نہ فرمائیں گے۔

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

مورخہ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء
میسور

خاکسار
آمنہ خاتون

فہرست

خواتین اور اُردو

خواتین سے میری مراد دنیائے اُردو کی خواتین نہیں بلکہ ریاست میسور کی مسلم خواتین ہیں۔ اس ریاست میں سترھویں صدی کی ابتدا سے اُردو میں تصنیف و تالیف کی شہادتیں موجود ہیں لیکن ان میں سے کوئی تحریر کسی خاتون نے نہیں چھوڑی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ یادگاریں زمانے کے انقلاب میں گم ہوگئی ہوں۔ بہرحال اب ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ البتہ شہر نلونگل، ضلع بنگلور کے نائطی خاندانوں کی بعض قدیم خواتین کے اُردو خطوط حسنِ اتفاق سے میں نے دیکھے ہیں۔ گھریلو اُردو میں بچ کے معاملات پر لکھے گئے ہیں اور صدی ڈیڑھ صدی پہلے کی میسور کی مسلم خواتین کی اُردو کا قابلِ تحفظ نمونہ ہیں۔ اس ریاست کے اور خاندانوں میں بھی خواتین کی قدیم تحریریں ممکن ہے کہیں ہوں۔ ان خاندانوں کی علم دوست خواتین سے استدعا ہے کہ وہ ان کے وجود سے دنیائے اردو کو روشناس کرائیں۔

اس ریاست میں بیسویں صدی کی ابتدا سے نظام درس کے حصول پر اُردو کی تعلیم عام ہے۔ اس سے پہلے شرفا کے گھروں میں اور پابندِ شرع گھرانوں میں خواتین دینیات کے ضروری مسائل جاننے کے لیے اردو پڑھتی تھیں۔ دینیات کی کتابوں میں "ملکی مصنفین" کی لکھی ہوئی کتابیں "مصباح الحیات" اور "چہار کرسی" عام طور پر پڑھی جاتی تھیں، یہاں

کی اردو خواں بڑی بوڑھیوں میں شاید ہی کوئی ایسی خاتون ہوں گی جنھوں نے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اس کی بیتیں انھیں زبانی یاد نہیں لیکن ایسے نیز ملکی پچالنے خاندانوں میں دینی معلومات ایک دوسری کی بتائی ہوئی برابر چلی آتی تھی۔ اور یہ امر حقیقت سے زیادہ مطابق ہے کہ ان خاندانوں کی خواتین بزرگانِ دین کے حالات اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات پڑھنے کے لیے اردو پڑھنا سیکھتی تھیں۔ چنانچہ قصص الانبیاء، تذکرۃ الاولیاء اور جنان السیر کی قسم کی کتابیں بہت مقبول تھیں خصوصاً جنان السیر مصنفہ واعظ عبدالعلی بنگلوری عروس کے جہیز میں قرآن مجید کے ساتھ دی جاتی تھی،

تقریباً پینتیس چالیس سال سے اردو پڑھنے والی خواتین کی دو مستقل جماعتیں بن رہی ہیں، پہلی وہ کثیر جماعت جو صرف اسلام اور بزرگانِ اسلام کے احوال معلوم کرنے کے لئے اردو پڑھتی ہے اور اس خواندگی کی بدولت قصے کہانیاں اور رسائل بھی پڑھ لیتی ہے اس جماعت میں ریاست میسور کے کل قدیم شیعی اور نائطی خاندان شامل ہیں اور کل میمنوں اور لبابین کے خاندان بھی داخل ہیں، جو یہیں رہ گئے ہیں اور اسی جماعت میں کل بیوپاری اور زراعت مزدوری وکاریگری پیشہ خاندان بھی داخل ہیں۔ اس جماعت کی تعلیم مڈل یا بھکتے ہائی اسکول کے درجے سے آگے نہیں بڑھتی اور دوسری جماعت میں ان خاندانوں کی بہو بیٹیاں داخل ہیں جن کے والدین سرکاری ملازم ہیں اور یہ اکثر و بیشتر تبلیغ علم یعنی استانی گری کے قصد سے اردو کی تحصیل کرتی ہیں، ان میں خاصی تعداد اعلےٰ تعلیم یافتہ خواتین کی موجود ہے۔ اور ان میں چند ایسی خوش نصیب خواتین بھی ہیں جنھوں نے اعلےٰ تحصیل علمی کے بعد اپنے آپ کو خدمتِ اردو کے لئے وقف کر دیا ہے، لیکن ان کا شمار خواتین کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور جب تک ان کی

تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو، یہاں کی اردو آزادانہ طور پر ترقی نہیں کر سکتی۔ پہلی جماعت میں دو ایک خواتین اگر استانیاں ہیں بھی تو اس صورت میں کہ انھوں نے استانی گری کو مد و معاش ٹھہرایا۔

اردو پڑھنے میں چونکہ دونوں جماعتوں کے مقاصد علاحدہ علاحدہ ہیں، اس لئے یہ ایک دوسرے سے دور دور رہتی ہیں۔ پہلی کثیر جماعت دوسری قلیل جماعت کو اپنی دانست میں دین داری اور قدیم رسم و رواج اور روایات اسلامی کی پابندی میں اپنے سے کم سمجھتی ہے اور دوسری جماعت پہلی جماعت کو اپنی دانست میں اصول دین اور فلسفہ مذہب اور امور دنیا اور حالات زمانہ سے بیگانہ سمجھتی ہے۔ مثلاً پہلی مذہبی جماعت کو دوسری تعلیم یافتہ جماعت کی خواتین پر یہ اعتراض ہے کہ ان کا طرز طریق ہندوانہ ہوتا جاتا ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ اسلام سے منحرف ہوتی جارہی ہیں تو دوسری تعلیم یافتہ جماعت کو یہ افسوس ہوتا ہے کہ پہلی جماعت کی خواتین کو نہ تو قرآن شریف کے اسرار و رموز یا انقلاب فرانس اور امریکہ کی جنگ آزادی کے اسباب و نتائج کی خبر نہیں یا وہ یہ نہیں جانتیں کہ علم موسیقی علم ریاضی کی ایک شاخ ہے یا یہ کہ فارسی اور سنسکرت زبانوں کی اصل ایک ہے اس لئے نہ ان کی دنیا درست ہے نہ دین۔ اور حق یہ ہے کہ دونوں جماعتوں میں افراط و تفریط ہے اور یہ افتراق ایک جماعت کی قدامت پسندی اور دوسری جماعت کی دماغ داری سے روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ ان اختلافات کو سمو کر ان میں اعتدال پیدا کرنے کی نہایت ضرورت ہے لیکن میں آج کی اس تقریر میں ان اختلافات کے جس نتیجے کی طرف سامعات کو متوجہ کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنا پر یہاں کی خواتین کو مجموعی حیثیت سے تصنیف زبان کی تحصیل کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ یعنی پہلی جماعت نے اگر دینیات، رسائل و حکایات کے لئے اردو پڑھی

تو دوسری طرف معلومات عامہ اور علوم و فنون کے لئے اس کو پڑھا۔ حاصل یہ ہے کہ چند مستثنیات کے سوا دونوں نے زبان دانی کے ارادے اور قصد سے اس کو نہیں سیکھا اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر اس ریاست میں خواتین کی اردو کا معیار بلند نہیں ہے اور اردو کی فصاحت میں سب خاندانوں میں یکساں ترقی نہیں ہوئی۔ دوسری قلیل جماعت کی جن منتخب خواتین کو فطری ذوق سے زبان دانی کا شوق ہے ان کا تناسب کثیر جماعت کے مقابلے میں ایک اور ہزار بلکہ اور زیادہ کا ہے۔ یہ جب خواتین کی عام مجلسوں میں صحیح اردو بولتی ہیں تو اس کی ہنسی اڑتی ہے اور ٹھٹھا ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر دو تحریر کی فصیحیں بھی جب آپس میں گفتگو کرتی ہیں تو احساس کمتری کی وجہ سے فصاحت کے پاس نہیں پھٹکتیں۔

رسالہ اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۴۶ء میں مہارانی کالج بنگلور کے رسالہ "ارمغان ادب" پر جو تبصرہ شایع ہوا ہے اس میں لکھا ہے :۔

"بعض مضمون بہت اچھے اور دلچسپ ہیں۔ زبان
بھی صاف ستھری ہے۔ میسور کی لڑکیوں کی زباندانی اور
مضمون طرازی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اب کون
کہہ سکتا ہے کہ اردو میسور کی زبان نہیں۔"

یہ حقیقت ہے لیکن صرف تحریر کی حد تک۔ عام گفتگو میں دکنی رنگ بہت غالب ہوتا ہے اور قواعد زبان سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔ ان خواتین کو جنھوں نے اپنی فصاحت و بلاغت کی داد مستند ادیبوں سے لے لی ہے۔ میں اپنی تہنیت پیش کرتی ہوں اور ان سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ مصلحانہ اور مجتہدانہ شان سے

مشکلے کی پرواہ کئے بغیر اپنے گھروں میں، اپنی ملاقاتیوں سے اور عام مجلسوں میں ویسی ہی اردو بولا کریں جیسی کہ وہ لکھتی ہیں آپ کی دیکھا دیکھی اور بہنیں بھی ویسی اردو بولنے لگیں گی اور صحیح اردو بولنے والیوں کی تعداد میں اگر ایک بہن کی سعی مشکور سے دو بہنوں کا اضافہ ہوا کرے تو اس ریاست کی اردو میں ترقی کی بڑی بڑی توقعات ہو سکتی ہیں۔

یوں تو ملک میسور میں مسلم فاتحین چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے آنے لگے تھے لیکن اورنگ زیب کے زمانے ہی سے اس ریاست میں مسلمان مستقل طور پر مقیم ہوئے۔ صوبہ داران رستم آباد عرف سرا اور سلطنت خداداد کے زمانے میں جتنے مسلمان خاندان یہاں آباد ہوئے ان کی زبان صاف طور پر کہہ رہی ہے کہ ان کا تعلق شمالی ہند سے ہے، یہاں کی قدیم زبان دہی پہلے دور کے شعرا آبرو یک رنگ اور حاتم کی زبان ہے دکنی کی زبان نہیں۔ یہاں تک کہ ویلور کے باقر آگاہ کی زبان بھی نہیں ہے۔ آج ہماری زبان پر جو متروکات ملتے ہیں وہ وہی ہیں جو کبھی دلی میں رائج تھے نہ کہ وہ جن کا رواج دکن میں تھا۔

حاصل یہ کہ میسور کی زبان دکنی نہیں شمالی ہند کی قدیم اردو ہے یہی وجہ ہے کہ جب یو۔ پی کا کوئی ادیب تمام جنوبی ہند کی سیاحت کے بعد بنگلور یا میسور آتا ہے تو یہاں کی زبان اور اس کے لہجے کو اپنے وطن کی زبان اور لہجے سے مطابق دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ یہاں کی زبان میں دکن میں تقریباً تین صدی کے قیام سے دکنی الفاظ مل جل گئے ہیں اور یہ فطری امر ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ ریاست میسور کے مسلمانوں کی مادری زبان پنجابی قواعد آمیز ٹکسالی اردو ہے نہ کہ دکنی کوئی سرسری مسئلہ نہیں اس پر آپ خواتین جس قدر زیادہ غور کریں گی اسی قدر میرے قول کی تصدیق ہو گی یہی وجہ ہے کہ

٦

یہاں کی خواتین معمولی مشقت سے اپنی اردو دانی کی داد مستند ادیبوں سے حاصل کر لیتی ہیں اور تحصیل زبان میں ان کی صلاحیتیں کل جنوبی ہند میں سب سے نظیر ہیں۔

۸

انشا کے شورش پسند حریف

تاریخ ادب زبان اردو میں محمد حسین آزاد انشا کے سب سے بڑے قدر شناس اور مداح ہیں۔ انشا کی شاعرانہ زندگی سے متعلق چند ناگوار مگر ناگزیر واقعات یعنے انشا کے اپنے معاصرین سے چند معرکے آب حیات میں بڑی شد و مد اور آن بان کے ساتھ منظر عام پر لائے گئے ہیں، اور آزاد نے نہایت نیک نیتی اور انہماک سے انشا کو حق بجانب ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، اور معقول سے معقول استدلال کیا ہے۔ اور حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے طبعی رجحان سے مجبور ہو کر جس کی تفصیل آئندہ آئے گی، اپنے تذکرے "مجموعۂ نغز" میں انشا پر جو تہمتیں تراشی ہیں، ان میں سے ایک ایک کا اپنی دانست میں مسکت جواب دیا ہے۔ لیکن قاسم کے الزامات کو اٹھانے کی یہ سب تدبیریں مجموعی حیثیت سے انشا کے حق میں الٹی ہو گئی ہیں۔ اور آزاد کی اس نا کام وکالت نے قاسم کی بیان کردہ حکایتوں کو ماند کر دینے کی بجائے وہ چمکا دیا ہے کہ ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں چکا چوند آجاتی ہے اور آزاد کی نیت اور مقصد کے عین برخلاف سارے الزام انشا کے سر تھپ گئے ہیں، اور ان کا قصہ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں مصحفی کا یہ مصرع بن کر آتا ہے ع واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے، چناں چہ آب حیات کے بعد کا کوئی تذکرہ آزاد کی نیک نیتی کی بدولت پھیلے ہوئے اس غیر متوقع اثر سے نہ بچ سکا۔

انشا کی طبیعت میں جو تازگی توانائی اور جدت تھی اس کو ان کے مستند علم وفضل نے ہمہ گیر بنا دیا تھا اور ان کا دل و دماغ تازہ اور اچھوتے خیالات سے لبریز ہو گیا تھا۔ اس پر ان کے خاندان کی فضیلت اور شرافت اور وجاہت مزید تھی۔ اس لیے وہ بہت نازک مزاج اور نکتہ رس بن گئے تھے۔ اگر کسی نے بے جا غرور کیا یا بے جا پیش قدمی کی تو ہرگز ہرگز ان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، یہ کسی میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے اور اپنے علم وفضل اور اپنی جدت وطراری سے سب پر سبقت لے جاتے تھے۔ ان کے معاصرین ان کی فضیلتوں کا صحیح اندازہ لگائے بغیر ہی میدان میں اتر آتے تھے اور منہ کی کھاتے تھے۔ لیکن ان کی معرکہ آرائیوں میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ پہل انشا کی جانب سے ہوئی ہو، لیکن جب ان کے معاصرین زیادتی کرتے تھے تو یہ انھیں شکست دینے میں پورے زور سے مقابلہ کرتے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مخالفین کو خفت اور ذلت اٹھانی پڑتی تھی۔

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ "انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانے کی تاریخ شاعری پر ایک بدنما دھبہ ہیں"۔ ان معرکوں کو جو تاریخ شاعری میں کوئی انوکھی یا ان ہونی چیز نہیں، ایک نہایت بدنما دھبہ بنا کر پیش کرنے کے ذمہ دار آزاد ہیں، ان معرکوں کے مذموم پہلوؤں کو چھپانے کے لیے ان کے جواز کی جو دلیلیں آزاد نے پیش کی ہیں ان کو خود انھیں کی زبانی سننا چاہیے۔ لکھتے ہیں :-

"چناں چہ ان معرکوں کے بعض حالات مناسب حال لکھتا ہوں۔ اگرچہ ان میں بھی اکثر باتیں خلاف تہذیب ہیں مگر فن زبان کے طلبگاروں کا خیال اس معاملے میں کچھ اور ہے .... عام مطالب کے ادا کرنے میں قوت بیانیہ کا اثر

نہایت ضعیف ہے ۔ ہاں ہجو کا کوچہ ہے کہ اس میں ایک چینک جو شاعر کے دل کو لگی ہوتی ہے تو وہ تاثیر کلام سے مل کر سوتے دلوں کی بغل میں ذرا گدگدی کر جاتی ہے ۔ بیان میں صفائی اور زبان میں گرمی وطراری پیدا کرنی چاہو تو ایسے کلاموں کا پڑھنا ایک عمدہ اوزار زبان کے تیز کرنے کا ہے ۔"

مرزا علی لطف کی گلشن ہند اور رنگین کی مجالس رنگین ان دونوں کی تکمیل سنہ ۱۲۱۵ھ میں ہوئی ہے ۔ جب کہ انشا اور مصحفی کے معرکے ختم ہو چکے تھے لیکن کسی نے ان معرکوں کا ذکر تک نہیں کیا ۔ خود مصحفی نے تین تذکرے لکھے ۔ اور آخری تذکرہ ریاض الفصحا سنہ ۱۲۳۶ھ میں انشا کی وفات کے تین برس بعد ختم ہوا ہے لیکن ان میں سے کسی تذکرے میں مستقلاً یا ضمناً ان معرکوں کا ذکر نہیں ۔ اگر ان معرکوں کو کسی نے اہمیت دی ہے تو صرف قاسم نے جو دِلّی کے مقیم ہیں اور جن کا ذکر خواہ شاعر کی حیثیت سے ہو یا تذکرہ نویس کی حیثیت سے کسی معاصر نے نہیں کیا ۔ قاسم لکھتے ہیں کہ :۔

" در بلدۂ لکھنؤ بمشاعرہ مرشدزادہ معظم الیہم بہ میاں غلام ہمدانی مصحفی کہ شاعرے است سکین نہادے بہ ہیچ بیے طرف شدہ کہ کار از گفتگوے رکیک کہ شایاں شان ہنرمنداں نبود واگذشتہ بہ ہجو گوئی کشید " ملث

آزاد نے اسی بیان سے بات کا بتنگڑ بنایا ہے ۔ چناں چہ ان معرکوں کے وقوع کا یہ سبب قرار دیا ہے کہ :۔

" اول تو مرزا سلیمان شکوہ کی غزل کو مصحفی بنایا کرتے تھے ۔ جب سید انشا پہنچے تو ان کے کلام کے سامنے ان کے شعر کب مزا دیتے تھے ۔ غزل سید موصوف

کے پاس آنے لگی" ایک اور جگہ لکھا ہے کہ پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔"

آزاد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشا کے لکھنؤ آنے سے پہلے سلیمان شکوہ لکھنؤ میں موجود تھے۔ اور مصحفی ان کی غزل بنایا کرتے تھے۔ اس بیان کے ایک ایک لفظ کی تردید واقعات تاریخی سے ہوتی ہے، علی لطف اور خود مصحفی کے بیان سے ظاہر ہے کہ مصحفی دوبارہ سنہ ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ پہنچے ہیں۔ اور انشا کا کلام شاہد ہے کہ وہ سنہ ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ آئے اور سلیمان شکوہ کا قیام سنہ ۱۲۰۵ھ سے پہلے لکھنؤ میں ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ تواریخ اودھ کے مصنف لکھتے ہیں کہ "فلاں شاہزادۂ ممدوح سنہ ۱۲۰۵ھ مطابق سنہ ۱۷۹۰ع عہد دولت نواب آصف الدولہ سے کہ وہ زمان گورنری لارڈ کارن والس بہادر تھا تا سنہ جلوس نصیر الدین حیدر شاہ زمان کمال اعزاز و احترام سے لکھنؤ میں رہے" ان سنین کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان شکوہ سے پہلے انشا لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور جب سلیمان شکوہ لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے تو انشا بھی ان سے متوسل ہو گئے، انشا سلیمان شکوہ کے باپ شاہ عالم کے درباریوں میں تھے اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے پھر سلیمان شکوہ کے دربار میں بھی ان کی بہت قدر ہوتی تھی انہیں خلعتیں عطا ہوتی تھیں اور انہیں کے مشورے سے مصحفی سلیمان شکوہ کے شاعروں میں پہنچے تھے، اور درباریوں میں داخل ہوئے تھے، آزاد کو مصحفی کے تذکرے پڑھنے کا یقیناً اتفاق[۱] نہیں ہوا ورنہ اپنی من گھڑت واقعہ نگاری سے ضرور گریز کرتے۔ اور ہرگز یہ لکھنے کی جرأت نہ کرتے کہ انشا سے پہلے مصحفی دربار میں پہنچ گئے تھے اور ان کی غزل بنایا کرتے تھے۔ مصحفی تذکرہ ہندی

---

[۱] تذکرے خوب لکھے ہیں۔ الخ آب حیات تذکرۂ مصحفی ص۳۱۳ یہ محض غلط بیانی ہے۔

میں سلیمان شکوہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ :-

"زرایا مے کہ حکم ترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کاردانان ایں فن درحضور آمدہ حاضر می شدند - ایں فقیر حقیر ہم چوں نسبت دیگراں باوصف گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت - بگفتۂ میر انشا اللہ خاں حسب الطلب حضور باوصف کم بغلی شکستہ حالی شریک مجلس یاراں شدہ بود چناں چہ درہماں تاریخ بہ حلقۂ ملازمانِ حضور در آمد .... و میر انشا اللہ خاں کہ بہ نائب و مختار حضور یعنی خاں صاحب قبلہ خان زادہ خان بہادر کہ ایشاں درشعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند، صیغۂ اخوت خواندہ اند ہمیشہ مورد گوناگوں الطاف خسروی می باشند و چند بار بانعام لائقہ قبا و گوشوارہ سرمباہات برافراختہ اند "

اور اسی تذکرے میں جو سنہ ۱۲۰۹ھ میں ختم ہوا ہے، جب انشا کا حال لکھا ہے تو اس میں ان کی سہ زبانی اور خاص کر فارسی دانی کی تعریف کی ہے، مثنوی شیر برنج کی نسبت لکھا ہے کہ "بسیار بصفا گفتہ و داد فصاحت زبان فارسی دروداده " اور اردو کلام کے متعلق لکھا ہے کہ "اگرچہ ہمہ کلامش در عالم ظرافت خالی از کیفیتے نیست اما آنچہ از اشعار سادہ اش انتخاب فقیر افتادہ ایں است الخ "

مصحفی کے اس بیان سے واضح ہے کہ کسی عنوان سے وہ انشا کو متہم کرنے کی جرأت نہ کرسکے حالاں کہ اس زمانے میں معرکے جاری تھے - مصحفی پر انشا کے بڑے بڑے احسان تھے -

" ہجو در بحر طویل " میں انشا لکھتے ہیں :-

" دل ہمچو حسن سید کہ ز اولاد حسین است .... دبود محسن برحق کہ بجز

رحمت ولطف وکرم بخشی وتعریف کمال وصفت پیش کسے گاہ بیاں ہیچ نگر دست و نہ ابود ثنا خواں ...... شدہ اثبات کہ تو دشمن دینی الخ "

اس کے بعد عجب معرکے ہوئے ہیں تو اپنی ایک غزل میں جو مصحفی کے جواب میں لکھی گئی ہے، سلیمان شکوہ اور آصف کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشا اور مصحفی کے معرکے آصف الدولہ کے زمانے میں ہوئے ہیں اور آصف الدولہ کی مدت حکومت سنہ ۱۱۸۸ھ سے سنہ ۱۲۱۲ھ ہے، اس لحاظ سے مصحفی اور انشا کے معرکے سنہ ۱۲۰۵ھ یعنی سلیمان شکوہ کے لکھنؤ میں ورود اور سنہ ۱۲۱۲ھ کے درمیان ہوئے ہیں، انشا کا شعر یہ ہے:-

ع بیٹھا ہو جہاں پاس سلیمان کے آصف — واں کیوں نہ جھکے قیصر و فغفور کی گردن

آزاد کی روایتوں کی تصدیق کے لئے ان معرکوں کے صحیح اسباب معاصرین کے کلام میں تلاش کرنے پڑتے ہیں، سودا نے مصحفی پر جو جرح وقدح کی ہے اور الزام لگائے ہیں ان سے صاف پتا چلتا ہے کہ مصحفی کوئی نچلے بیٹھنے والے بزرگ نہیں تھے اور خواہ مخواہ اکابر معاصرین سے الجھ کر رسوائی اٹھانا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔

مصحفی سودا کی نظر میں سودا کے کلیات میں جو سب سے پہلا قصیدہ ہے وہ مصحفی کی ہجو میں ہے، اور سودا کے کل قصائد کے اشعار کی مجموعی تعداد کے ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہے خود سودا کو اس سیر حاصل قصیدے پر ناز ہے۔

غرّا و فصیح اور بلیغ ایسا قصیدہ	ہے مصحفی کیا کہہ نہ سکے مصحفی کا پیر
صد آفریں ہے بلکہ ہزار آفریں تجھ کو	کیا طول دیے تو نے یہ قصیدہ کیا تحریر
حسن نظم کی عمر خضر و عمر مسیحا	آگے کرے تطویل کی کوتاہی و تقصیر

بقول راقم آثم کا قصیدہ جو سودا کی حمایت میں لکھا گیا ہے غلطی سے سودا کی طرف منسوب ہو گیا ہے، لیکن اس غلطی سے وہ نتائج غلط نہیں ہوتے جو اس قصیدے سے اخذ کئے گئے ہیں ۱۲۰۔

ان قافیوں میں آٹھ سو اور کتنے ہیں شمار — کس طرح سے اس میں نہ قوافی ہوں یہ تکریر

اور اس قصیدے کی تصنیف کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ :-

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر — کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

کرتا ہے تو اس شاعری کی ہجو و مذمت — جو شاعری خورشید کی صورت سے جہانگیر

مغرور ہوا اتنا ہے تو اس بے ہنری پر — کیا کم ذہنی سے تری طینت کا ہے تخمیر

اس غرے اور حماقت کے ثبوت میں مصحفی کا ایک شعر پیش کیا ہے :

شانے پہ مرے گو مہر نبوت نہیں لیکن — کرتا ہوں صاف دعویٰ دعوی پیمبری

اس کے جواب میں کئی شعر لکھے ہیں جن میں کا ایک شعر یہ ہے :

اس شعر سے کچھ شعر کا فخر یہ نہ نکلا — اور پوچ یہ بک کر تو ہوا داخلِ تکفیر

پھر قصیدے کی تصنیف کے مزید وجوہ گنائے ہیں -

"سودا کے تئیں کہتے ہیں تھا شاعرِ مغلق" — کیا مصرع بے ربط کیا تو نے یہ تحریر

سودا کو کوئی شاعرِ مغلق نہیں کہتا — یہ خلق پہ ہے از رہِ بہتاں تری تقریر

کیا خوب مضامین میں کرتا ہے مذمت — حشووں کی تو اپنے ہوا آزردہ و دلگیر

اے مصحفی اپنا جسے کہتا ہے تو دیوان — نفرین خلائق کی ہے گویا کہ وہ جاگیر

"مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو" — کیسی وہ زباں جس سے تو کرتا ہے یہ تقریر

دعویٰ کرے ہے ہمسری و ہم سخنی کا — ساتھ اس کے تو اے مادۂ حیلہ و تزویر

"سچ پوچھو تو اردو کی فقط صاف زباں ہے" — مضموں نہیں کر جانتا زنہار وہ تحریر

اس شاعرِ ساحر کے کہے حق میں تو یہ بات — ہے تیری حماقت کی دلیل اب یہی تقریر

"معنی ستم لفظ سے فریاد کناں ہے" — اور مصرعِ ثانی میں یہ مضموں ہے گرہ گیر

دعویٰ جو کرے ہمسری کا شعر میں اس سے — داناؤں میں ہوتا ہے بہ تحمیق وہ تشہیر
تو ویسے کے اذکار کو از بس کہ مراک جا — بے موجب تقریب جو لاتا ہے بہ تحقیر
کہتے ہیں کہ اس عہد میں سودا نہیں ہے ہے — یہ حرف بھی کیا محض غلط رکھتا ہے تشہیر
سودا کی جو مسند ہے معانی کی سو اس پر — کہتا ہے تو بیٹھا ہوں میں باعزت و توقیر
کیا ربط سخن کو ترے سودا کے سخن سے — ذرے میں کہاں مہر جہاں تاب کی تنویر
تو نام لے اس خالق معنی کی جگہ کا — اس بے ادبی کی تجھے اللہ دے تعزیر
"آویں نہ کریں مجھ سے فن شعر میں پنجہ — سودا تو نہیں بیٹھے ہیں سودا کی جگہ میر"
جس طرح فن شاعری میں کرنے کو پنجہ — للکارے ہے تو میر کو ہے طرفہ یہ تقریر
اول تو تجھے میر سے کیا پنجہ نسبت — زنہار تجھے چھوڑوں سے نہ پنجہ کریں گنجیر
سودا کو تکے بیٹھے جو کہتا ہے تو ان کو — کیا چکھنے میں سودا کے ہوئے ایک کے وہ میر
ہر چند کہ بھی میر کے اوپر یہ منھ آیا — پر اس میں بیاں کر گیا سودا کی بھی تحقیر
اس چکھنے کو اور کھانے کو کیا کہتے ہیں ایسے سگ — طعمہ ہیں سب اس کے جو اجل نام ہے، اک شیر
ظاہر ہے حسب اور نسب بھی ترا مجہول — تحقیر کو ننگ اس سے ہے تیری ہے جو توقیر
مرزا کو ترے سامنے مطلق نہیں کچھ قدر — اک ذرہ نہیں پاس ترے میر کو توقیر
بے پیر تو کہتا ہے جنھیں ان کی زبانی — مطلع ہے یہ پہنچے نہ جسے مہر کی تنویر
بے پیر فقط تو ہے کسی کی نہیں تقصیر — سودا سا نہ کہہ جا کے کہے خلق کو بے پیر
کیوں خلق کو تو دیتا ہے جھنجھلا کے یہ دشنام — پوچ آپ کے خلق کی ثابت کرے تقصیر
گھٹ جاتی تری شاعری کی کچھ نہ مشیخت — سودا کو اگر یاد نہ کرتا تو بہ تحقیر

اس کے بعد اسی زمین میں مصحفی کے قصیدے کی چند غلطیاں بتائی ہیں اور لکھتے ہیں کہ :-

اس پر ہے تجھے فارسی گوئی کا بھی دعویٰ — کیا تاب بیاں سے ہو تری مغلوں کی تقریر
ہے فارسی و ہندی تری مضحکہ جو سہے — طینت کا تری بس کہ حماقت سے ہے تخمیر
ہندی میں ہے یہ انوری و سعدی کا استاد — اور فارسی کے فن میں ہے عنصری کا پیر
صاحب ہیں کئی اس طبقے میں شعرا کے — ہم بزم سخن ان کو نہ ان سے کرے تقریر
کچھ باپ کا تیرے وہ نہ تھا قتل کا باعث — اللہ وہ بد اوست تو ہے نزدیک بہ تکفیر
ظاہر میں اگر اس کے تجھے کیجیے مقابل — ننگ اس کے غلاموں کی ہے تیری توقیر
اک صفحہ رہا تیرے نہ دیوان کا خالی — اس مرتبہ سودا کے مطاعن کئے تحریر
اس تذکرہ پوچ میں اسے مفتری اپنے — احوال لقا میں جو کیا تو نے یہ تحریر
مرزا سے کئے لکھتے ہیں میر کے اس نے — جھوٹا ہے تو اور جھوٹ ہے وہ تیری تقریر
وہ میر کے پول اس کے تھے جوں لشکر خفاش — ہو میر کہ پرواز بہ خورشید جہانگیر
اس ذکر کو سن من و عن اب میری زباں سے — کھینچوں ہوں اس احوال کی تقریر میں تصویر
لے سمجھی اس طرح سے یہ سانحہ گزرا — جو تو نے لقا سا کہ کئے میر کے تحریر
استاد کے کہتے ہیں تو اس نے کہ لقا کے — گر میر کہ سمجھے تو ہے اس میں تری تقصیر
نسبت کسے ہے سرقے کی اور جہل کی اس سے — رکھ لعنتوں پہ شدید کی اپنے کرے تقریر
اغلاط و توارد کا کیے اس پہ تو بہتان — لعنت ترے اس جھوٹ پہ اے مفتری بے پیر
گر نظم و گر نثر میں جو تو نے لکھا ہے — کچھ شان کی اس کے نہیں شایاں وہ تقریر
شدت سے حماقت کے ٹھہرتا نہیں اک جا — لکھے ہیں کہیں بار ہے کہیں ذم کرے تحریر
یا چھائی ہوئی دل پہ کرے عنق کی ہے جو صولت — اس واسطے کرتا ہے تو ایسی ہوئی تقریر
وہ کون ہے جس شخص کے احوال کو تو نے — لکھا نہیں ہے بدطور سے یہ تحقیر

اس تذکرے میں تیرے کسی شخص کے حق میں اظہار معائب کے سوا کچھ نہیں تذکیر
اس قصے کے لکھنے کا ہوا مصحفی باعث تھا ورنہ دماغ اس کے کیسے کرنے کا تحریر

سودا کا انتقال سنہ ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور مصحفی کی ہجو میں اتنا طول طویل آٹھ سو سے زیادہ شعر کا قصیدہ چار و ناچار اس وقت لکھنا پڑا جب کہ سودا کی عمر پینسٹھ سال کے لگ بھگ بلکہ اس سے بھی متجاوز ہو چکی تھی۔ گویا سودا کے قصیدوں کے پچیس فی صدی شعر صرف مصحفی کی غلط بیانیوں، ان کی شاعری کی دل آزاریوں فتنہ پردازیوں اور انھوں نے مشاہیر معاصرین کی جو تذلیل و تحقیر کی تھی اس کی تردید میں صرف ہو گئے۔ لیکن حق یہ ہے کہ سودا کی تحصیل علمی ان کی شاعرانہ قابلیتیں معاصرین کے ساتھ ان کے تعلقات، حکام وقت کا ان سے سلوک، لکھنؤ کے اس وقت کے شعرا کی ذہنیتیں ان کے گروہ اور ان گروہوں کی آپس کی میں میں تو تو کا اندازہ لگانے کے لیے جتنا یہ قصیدہ کارآمد ہے اتنا سودا کا بقیہ کلام نہیں، درحقیقت اس قصیدے کی تصنیف کی اصل وجہ مصحفی کی اشتعال انگیزی ہے۔ مصحفی کی افتاد طبیعت ان کے دیوان اور ان کے تذکرے کے متعلق جتنی معلومات اس قصیدے سے بہم پہنچتی ہے وہ کسی معاصر تذکرے سے نہیں ہوتی۔

اسی قصیدے میں سودا نے اپنے اور رنگین کے واقعے کو مصحفی کی غلط بیانیوں کی تردید میں پیش کیا ہے اور اس کی تفصیلات میں سعادت علی خان کا ذکر آگیا ہے۔ اس سانحے کا وقوع سنہ ۱۱۸۸ھ یعنے آصف الدولہ کی تخت نشینی اور سنہ ۱۱۹۱ھ یعنے سعادت علی خاں کی بنارس کو ہجرت کے درمیان ہونا چاہیے، کیوں کہ سعادت علی خاں کا قیام سنہ ۱۱۹۱ھ سے سنہ ۱۲۱۲ھ تک بنارس میں رہا یا ممکن ہے کہ سودا نے ان حالات کو سنہ ۱۱۹۱ھ کے بعد نظم کیا ہو۔

آزاد نے اپنی جدت طرازی سے اس واقعے کی نقل میں بھی فاش غلطی کی ہے، لکھتے ہیں :-

"بھائی صاحب بڑا غضب ہے آپ کی حکومت اور شہر میں یہ قیامت آصف الدولہ نے کہا، بھئی خیر ہے، انھوں نے کہا کہ مرزا رفیع سودا جن کو بادا جان نے برادر من اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا، آرزوئیں دلوا کے بلایا اور وہ نہ آیا۔ آج وہ یہاں موجود ہے اور اس حالت میں کہ اگر اس وقت میں نہ پہنچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس بچارے کو بے حرمت کر ڈالا تھا۔ پھر سارا ماجرا بیان کیا"

آزاد کا یہ بیان تاریخی طور پر صحیح نہیں، سعادت علی خاں سودا کو نہ آصف الدولہ کے پاس لے گئے اور نہ نواب سے کچھ کہا۔ درحقیقت سعادت علی خاں مسند وزارت کے دعویدار تھے اور یہ آصف الدولہ سے اور آصف الدولہ ان سے سخت ناراض تھے۔ سودا کا بیان واقعات تاریخی کے مطابق ہے :-

اس طرح سے جب لے چلا تنہا اسے پاکر　　وہ لشکرِ شیطان وفا پیشہ بے پیر
گھر اس کے سے لے پہنچے تھے تا بیتِ قسم اس کی　　ناگاہ تماشا یہ دکھلانے لگی تقدیر
نواب سعادت علی خاں ہاتھی کے اوپر　　با فوج و حشم اس گھڑی آ کر ہوئے رہ گیر
بٹھلا لیا نواب سعادت علی خاں نے　　سودا کے تئیں اپنی خواصی میں بہ توقیر
نواب سودا کے تئیں لے گئے ہمراہ　　داخل ہو مکاں میں لگے فرمانے یہ تقریر
حاکم نہیں اس عہد کا مجبور ہوں ورنہ　　تم دیکھتے ان کے تئیں دیتا جو میں تعذیر

یہ کلام سعادت علی خاں کی طبیعت کے عین مطابق ہے، اپنی مجبوریوں کے ضمن میں حاکم وقت کی ناراضگی کی وجہ سے مجرمین کی جو بے عزتی ہوتی تھی اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

احوال یہ کہ عرض ہو نواب سے رخصت — کر آیا ہی رات کو گھر اپنے میں شبگیر
پہنچی جب اسے یہ خبر آفاق میں جو تھا — فرمایا وہیں آ کے ہو وہ کلب شکن شیر نر
وہ آصف جاہ کہ عدل اس کے سے دائم — شاہیں رہا عہد اس کے میں محکوم عصافیر
مختار تھا اس عہد میں نواب کا نائب — لاتا تھا ممالک کے وہ اپنے یہ تسخیر
فرمایا اسے آصف دوراں نے بلا کر — ان شیخوں کی تم نے سنی بے ادبی و تقصیر
کھدوا دو محلے کو ابھی جا کے انھوں کے — اور منہدم اس کو کرو جو ان کی ہے تعمیر
پھر ان میں سے اک ایک کو گنگا کے کرو پار — اخراج سبھوں کو کرو لے طفل سے تا پیر
اور پہلے اسے پار اتروا دو کہ جس نے — بھیجا تھا ان اشرار کو از بہر دو گیر
لاؤ مرے احکام کو تم جلد عمل میں — خاصے میں نہ کھاؤں گا اگر اس میں ہوئی دیر

تعجب ہے کہ آزاد نے استادانِ وقت سودا اور میر کے ساتھ مصحفی کی ان حماقتوں اور اشتعال انگیزیوں کو نظر انداز کر دیا اور آزاد کا اتباع کرنے والوں نے ان کے قول کو جانچے پرکھے بغیر انشا کے اس اعتراف کے باوجود کہ :-

"قسم میخورم الکنوں کہ مرا ہیچ نہ ہجو تو سرو کار نبود است، ولے از طرف گشت شروع ایں ہمہ احوال مزخرف"

مصحفی کے ساتھ معرکے کا سارا الزام انشا ہی کے سر تھوپ یا، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سودا کا یہ قصیدہ کسی نے نہیں پڑھا ہوگا۔ بعض وقت انسان حقائق کی چھان بین اس لئے نہیں کرتا کہ اسے اپنے مفروضات کے غارت ہو جانے کا رنج ہوتا ہے سودا کے قصیدے سے میں نے اوپر لکھے ہوئے جستہ جستہ اشعار کا انتخاب اس طور سے کیا ہے کہ کل واقعے کا ایک مجمل خاکہ پیش نظر رہے، اس میں سودا نے مصحفی کی زیادتیاں

فرمانروائی امور سلطنت

گنائی ہیں۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مصحفی کو جہاں کبھی زک ہوئی ہے اور جب بھی انھوں نے خفتیں اٹھائی ہیں تو پہل انھیں کی طرف سے ہوئی ہے ۔

قضیئے کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

مصحفی نے اپنا دیوان مرتب کیا۔ اور اس میں اس قدر سودا کے مطاعن تحریر کیے کہ دیوان کا کوئی صفحہ ان سے خالی نہ رہا۔ ہر صفحے میں سودا کی شاعری کی ہجو و مذمت کی، ان کو شاعر مغلق کہا اور لکھا کہ انھیں مضمون و معانی سے کچھ بہرہ نہیں، ان کے کلام کے متعلق کہا کہ :۔

سچ پوچھو تو اردو کی فقط صاف زباں ہے ۔ معنی ستم لفظ سے فریاد کناں ہے

مصحفی سودا کے اذکار کو بے موجب تقریب ہر جگہ لاتے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ سودا بحیثیت شاعر مر چکا ہے۔ اب میرا دور دورہ ہے اور میں اس کی مسند معانی پر باعزت و توقیر بیٹھا ہوں اس کی سپہ سالاری سخن ختم ہو گئی ہے اس کے ہاتھوں سے میر نے شاعری کا علم چھین لیا ہے اور میر سودا کو چکے بیٹھے ہیں، لیکن وہ بھی آئین اور فن شعر میں مجھ سے پنجہ کریں۔ "مصحفی کہتے تھے میر و مرزا شاعران بے پیر ہیں۔ سودا پوچھتے ہیں آخر اس عناد کا باعث کیا ہے۔

ہے کچھ باپ کا سر تو وہ نہ تھا قتل کا باعث ۔ للہ عداوت تو ہے نزدیک بہ تکفیر

اس قدر للّٰہی بغض پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے تذکرۂ "عقد ثریا" میں لکھا ہے کہ سودا کے کلام میں سرقہ ہے، جہل ہے، اغلاط ہے، تکرار ہے، اور پھر بقا سے سودا کے معرکے کا قضیہ محض جھوٹ اور افترا ہے۔ انھوں نے تذکرہ کیا لکھا ہے ہر بھلے آدمی کی پگڑی اچھالی ہے اور یہی اس تصنیف کی غرض و غایت ہے۔ ان غلط بیانیوں کی تردید کے لیے سودا

کہ یہ قصیدہ لکھنا پڑا ۔

ع تھا ورنہ دماغ اس کے کیے کرنے کا تحریر

ان امور کی روشنی میں سلیمان شکوہ کے درباری مشاعروں میں اور ان کے باہر انشا و مصحفی کے معرکوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ کون صاحب ہنگامہ آرا تھے ۔

صاف ظاہر ہے کہ معاصرین پر چوٹیں کرنا اور ذلتیں سہنا مصحفی کی فطرت ثانی بن گئی تھی ۔ اپنا سکہ قائم کرنے کے لئے صرف یہی ایک مسلک ان کے ہاتھ آیا تھا ۔ چناں چہ جب یہ لکھنؤ پہنچے ہیں تو اس وقت میاں جرأت کا طوطی بول رہا تھا اور سارے شہر کے لوگ جرأت کی گرمی سخن سے محظوظ ہو رہے تھے اور مصحفی کی طرف کوئی ملتفت نہیں ہوتا تھا مصحفی نے اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر جرأت اور ان کے شاگردوں سے مخالفت شروع کی اور بیس برس تک انھیں جھگڑوں میں پھنسے رہے چناں چہ دستور الفصاحت کی یہ عبارت اس کا ثبوت ہے :-

" وشمہ از قوت وجودت طبیعت این است کہ در ایامے کہ وارد لکھنؤ گردیدہ آں وقت دور دور میاں جرأت بود و مردم شہر ہمہ سحر طرز دلپسند او ۔ مشار الیہ چوں دید کہ کسی ملتفت بحالش نمی شود ۔ با جرأت طرح خلاف انداختہ تنہا با او و لشکر تلامذش مقابل شد و در اندک عرصہ خود ہم شاگردان بسیار بہم رسانیدہ در مشاعرہ ہائے لکھنؤ شعر میخواند و تا بست سال بہمیں نزاع و مخاصمت بسر بردہ آخر نام نامی خود مثل او بلکہ زیادہ تر از و بر جریدہ شہرت و نام آوری ثبت نمود "

آزاد نے مصحفی کی غزلوں سے یہ بات اخذ کی ہے کہ "ان معرکوں میں سلیمان شکوہ بلکہ اکثر امرائے سید انشا کا ساتھ دیا اور حریف کے سوانگ کو قوال سے کہہ کر ایک فقرہ رکوا دیا" بقول مصحفی، انشا "بزم و رزم میں پائے تخت کے مشیر تھے" اور سارے سر برآوردہ امرا ان سے برابر کا سلوک کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی صحیح واقعات سے کما حقہ واقفیت تھی، سب سمجھتے تھے کہ زیادتی اور پہل مصحفی کی جانب سے ہوئی ہے جب مصحفی ملازم ٹھیرے اور ان امرا کی نظریں ان کی طرف سے ہٹ گئیں تو کیا تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے انشا کا ساتھ دیا ہو۔ آسی لکھنوی اپنے مضمون "انشا کے کچھ نئے حالات اور غیر مطبوعہ کلام" میں جو رسالہ اردو بابت اکتوبر سنہ ۵۴ء میں چھپا ہے لکھتے ہیں " تذکرہ معرکہ خوش زیبا (غیر مطبوعہ) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ہنگامہ خود شاہزادہ سلیمان شکوہ کے اشارے سے اٹھا تھا" مصحفی نے ان کدورتوں کو صاف کرنے کے لئے ایک قطعہ معذرت میں کہہ کر سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کیا ہے اور سارے الزاموں اور ساری ہنگامہ آرائیوں کو اپنے شاگردوں سے متعلق کر دیا ہے۔ اگرچہ خود بانی مبانی تھے۔

کیا میں عرض کہ میں آپ اس سے ہو گزرا / پھرے گا مجھ سے کوئی گرم و منتظر کا ضمیر
اعدا ان پہ کبھی جو کیا میں نے تازیانہ منع / تو ہو سکے ہے کوئی ان کے دفع کی تدبیر
پھرا ہے ہند میں کتنے ہزار جا پہ ملیں / پھریں ہمیشہ لئے جمع ساتھ اپنے کثیر
نہ مانیں تیغ سیاست نہ قہر سلطانی / نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربت شمشیر
مزاج ان کا فضول اس قدر پڑا ہے کہ وہ / ہنسی سمجھتے ہیں اس بات کو نہ جرم کبیر
تکلیف جن کو خدا نے کیا ہو موزوں طبع / اور اپنے فضل سے بخشی ہو شعر میں توقیر

یہ کوئی بات ہے سن کے وہ خموش رہیں — ہوا ہے مصلحتاً گو کہ تصفیہ یہ اخیر
مگر یہ بات ہیں مانی کہ سوانگ کا بانی — اگر میں ہوں تو مجھے دیجے بدتریں تعذیر

یہاں لکھ دیا ہے کہ میں گرم و منتظر کو لاکھ سمجھاؤں وہ کسی کی کب مانتے ہیں، شہدوں میں وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ انبوہ کے انبوہ ان کے ساتھ رہتے ہیں اگر وہ ہنگامہ برپا کریں اور سوانگ نکالیں تو میں بے بس ہوں اور بے گناہ ہوں۔ لیکن جب تذکرہ ہندی میں گرم و منتظر کے احوال لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ وہ میرے قائم مقام ہیں اگر وہ کسی سے میرے لئے مقابلے کرتے ہیں تو مطلب ہے کہ میں مقابلے کر رہا ہوں چناں چہ لکھا ہے :-

گر اس پہ صلح کی ٹھہری رہے تو صلح سہی — اگر ہو پھر شرارت بشر ہوں میں بھی شریر
جواب ایک کے پاں دس ہیں اور دس کے سو — نگاہ کرتے تھے اول باہیں قلیل و کثیر

منتظر کے بارے میں ان کی اپنی عبارت یہ ہے کہ :-

" منتظر ۔ اگرچہ بعض اشخاص ذہانت طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ او را بطریقے بہ حلقہ بیعت خویش کشند۔ ہرگز التفات نہ کردہ تا آنکہ بہ برکت راسخ الاعتقادی خویش بمقام والائے شاعری رسیدہ۔ حالا برائے کار شکنی آنہا برابر من موجود است "۔ جبھی تو انشا نے میر عفر علی کی زبان سے کہا ہے کہ "دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھے ضرب زیدٌ عمروًا کی ترکیب تو ذرا بیان کرے تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں "

مصحفی کے اس قہر درویش کا نتیجہ کیا ہوتا تھا؟ شیخ احمد علی صاحب مخزن الغرائب احوال انشا میں لکھتے ہیں :-

" چند سال پیش ازیں مصحفی ریختہ گو را آں قدر رسوائے کوچہ و بازار کرد کہ اگر غیرت می داشت خود را می کشت ہمیں بر خر سوار کردن باقی ماندہ بود دیگر ہیچ ذلتے نماند کہ نصیب آں بیچارہ نشد "

انشا کا سب سے پہلا معرکہ دلی میں ہوا، قاسم نے اس معرکے کا ذکر حسب ذیل کیا ہے :-

"چوں کہ سرداری اور اخلاق پروری بزرگوں کا شیوا اور ان کی شان ہے۔ مرزا[1] صاحب موصوف اپنے مشاعرے میں ہر شخص سے اچھا سلوک کرتے اور مدارات سے پیش آتے تھے، جس شخص کا بھی شعر ہوتا انصاف کی رو سے اس کی تعریف ہوتی۔ مرزا صاحب اپنی تمام عنایتیں اور شفقتیں حکیم ثناء اللہ خاں فراق اور مرزا عظیم بیگ عظیم پر مبذول فرماتے، بشریت کے تقاضے سے یہ بات میر انشاء اللہ خاں انشا اور برکت اللہ خاں برکت اور مشتاق علی خاں مشتاق کو پسند نہیں تھی کہ ان کے سوا کسی اور کی تحسین آفرین ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تخت سلطانی کے پاس کھڑے ہونے والوں کو بساط عزت پر بیٹھنے والوں کی فوقیت کب اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بزرگ عموماً اور میر انشا خصوصاً مرحوم سے جو واقعی بہت اچھا شاعر لیکن "نہایت پرخود غلط" تھا سخت ناخوش رہتے اور ہم میں سے ہر ایک کو ذلیل کرنے کا قابو تلاش کرتے رہتے تھے، ایک دن عظیم نے ایک غزل کہی لیکن غرور کی وجہ سے مضمون و معانی کی دھن میں بحر رجز میں تیرتے تیرتے ایسا غوطہ کھایا کہ بحر رمل میں جا پڑا اور غزل لکھ چکنے کے بعد دوستوں کو سنائے بغیر بے تحاشا ماشاء اللہ خاں مرحوم کے سامنے جو مرزا عظیم بیگ کے محسن تھے پڑھ دی۔ سوء اتفاق سے میر انشا بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ اس غزل کی حریفانہ داد دی۔ دوبارہ پڑھوا کر سنی اور یاد کر لی۔ پھر یاروں کو بھی یاد کرا دی۔ اور مشاعرے کی بھری مجلس میں تقطیع کی فرمائش کر کے عظیم کو ملزم ٹھیرایا۔ اس وقت اس پر جو گزری سو گزری اور سنا جو کچھ کہ اس نے سنا، اگرچہ اس واقعے کے بعد اپنی لغزش کے جواب میں ایک مخمس کہا ہے اور اس میں سید انشا کی ہجو ملیح کی ہے مگر وہ مشت بعد از جنگ تھی۔ اس کے بعد مرزا اس قدر چوکنا ہو گیا تھا کہ اگر ایک مصرع بھی موزوں کرتا تو مجھے سنائے بغیر کسی کے سامنے پڑھنا تو درکنار اس کا ذکر تک نہیں کرتا تھا، کہتا تھا، "بابا

---

[1] مرزا میڈھو خلف نواب شجاع الدولہ۔

دیوار ہم گوش دارد" ہوتے ہوتے ان صاحبوں کی ناخوشی اس درجے پہنچی کہ ہر غزل میں اپنی تعلی اور ہماری توہین اشاروں کنایوں میں کرتے تھے۔ کبھی چند عربی لفظوں کو جوڑ کر موزوں کر لیتے، کبھی غزلیں گھڑ کر پڑھتے۔ لیکن جب سب تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں تو مجبور ہو کر ایسی حرکت کی کہ جس کا تو ذکر کیا ہے کسی صاحب غرض عامی سے بھی اس کا امکان نہیں۔ ایک دن شاہ عالم سے انھوں[2] نے عرض کی کہ فلاں فلاں یعنے ہم بیچارے عام مشاعروں میں حضور کی غزل پر کھلے بندوں قہقہے لگاتے ہیں۔ اگر بادشاہ کے مزاج میں عدل حلم و تمکنت نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ اپنے ہم زبانوں کی ہتک عزت کا انھوں نے پورا اہتمام کر لیا تھا۔ بادشاہ بات کی تہ کو پہنچ گئے اور فرمایا کہ آئندہ سے حضور والا کے اشعار مشاعرے میں نہ پڑھیں۔ کہنے والے پر خدا کی رحمت ہو ے

" تواضع کند ہوشمند گزیں نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

انھوں[3] نے پھر عرض کیا کہ ہم ان بے ادبوں کی ہجو کریں گے۔ بادشاہ نے کہا کہ خبردار اس خیال محال کو چھوڑ دو۔ یہ گنبد کی صدا ہے۔ جیسا کہو گے ویسا سنو گے۔ اتفاقاً دربار کے دستار بندوں میں سے ایک دستار بند وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس پر خدا کی رحمت ہو وہ قصداً میرے پاس آیا اور ہنستے ہوئے کہا کہ آج آپ کا ذکر بارگاہ سلطانی میں آیا تھا۔ میں نے پوچھا خیر تھا یا شر، کہا، شر تو تھا لیکن بادشاہ عالم پناہ کے انصاف سے خیر میں بدل گیا۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

اور جو کچھ گزرا تھا کہہ سنایا۔ ہم نے اس حکم پر کہ اذا اضطروا فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور، بزرگان دین کی متبرک روحوں سے خصوصاً غوث الاعظم دستگیر رحمۃ اللہ علیہ کی روح سے مدد چاہی اور باہم مشورہ کر کے ان صاحبوں کے جواب میں عربی اشعار وغیرہ رطب یابس مہیا کیا۔ پھر کئی دوستوں

کو جمع کیا۔ "بعض کو ادھر ادھر لگا رکھا" اور "رزم زبان و بیان و تیغ و سنان" کا تہیہ کر کے بزم سخن میں حاضر ہوئے۔ اتفاقاً شیخ ولی اللہ محب مرحوم اس مشاعرے کے حکم تھے انھیں ہمارے اس منصوبے کی اطلاع ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس فتنے کی آگ کو جو بھڑک چکی تھی، بجھانے کی نہایت کوشش کی اور مرزا مینڈو کو اس ہونے والے واقعے کی خبر دی لیکن یہ تین بزرگ اپنی خود سری اور غرور کی وجہ سے مجلس میں پہنچ کر حسب عادت فخریہ غزلیں پڑھنے لگے سید انشا نے ایک غزل بڑی شد و مد سے پڑھی جس میں اپنے آپ کو بحر بیکراں اور دوسروں کو سیل بیاباں اور اپنے عربی اشعار کو "الم ترکیف" یعنے کلام الٰہی اور حریفوں کے اشعار کو مسیلمہ کذاب کا "الفیل ما الفیل" قرار دیا تھا۔ نواب صاحب در جناب محب نے اشاروں میں کنایوں کا لیکن آپ برابر پڑھا کیے۔ یقیناً فتنے کو دبانے کے ارادے سے ہر بیت پر ہماری طرف مخاطب ہو کر کشادہ روئی سے فرماتے تھے صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ یہ فخر شاعرانہ ہے جو کرنا چاہیے کرنے کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً فلاں نے یوں کہا ہے اور فلاں نے یوں، ان تسلیوں کے چھینٹوں سے غصے کی آگ اور بھڑکتی تھی، خاموش بیٹھے پیچ و تاب کھایا کیے۔ جب میری باری آئی تو میر صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ ذرا سنئے یہ بیچارہ جس کو اپنے ہی اعمام سے مسیلمہ کذاب کا خطاب ملا ہے اپنا الفیل ما الفیل پڑھتا ہے۔ اس وقت جب دوسرے شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے تو فساد کی آگ بجھانے والے ان تینوں کو صورۃ حال واضح طور پر سنا چکے تھے۔ اب جب کہ میں نے یوں خطاب کیا تو ان سب اور نواب صاحب کو یقین ہو گیا کہ میں کوئی رکیک ہجو پڑھوں گا۔ خدا نخواستہ میں اور خصوصاً ایک اہل علم و ہنر پرور سید کی ہجو کروں۔ دفعتہً نواب صاحب بزرگی کو کام میں لا کر ان صاحبوں اور میر مشاعرہ کے ساتھ اٹھے۔ اور ہماری جگہ پہنچ کر بدل جوئیاں کیں، ان

بزرگوں نے خصوصاً سید انشا نے شرافت خاندانی اور علو حوصلہ کا کام کیا۔ ہر ایک کے گلے ملے، ع مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست۔ مخش قسمیں کھائیں اور کہا کہ سیدی ان بے رویشیوں کی ذمے دار صرف مرزا کی بے پروائیاں ہیں کہ ہمارے اشعار پر سر تک نہیں ہلاتا، اور اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتا ہے۔ اثنائے گفتگو میں عظیم نے کہا، بابا میں نے اپنی عرض حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر ابھی تضمین کی ہے اور فی البدیہہ پڑھا

عظیم اب گئے ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا — طرف ہر اک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کبھی سکھن باز کھنڈ گروں میں ہے نہ ہو اعتبار اپنا — جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا انھیں کو وقار اپنا

عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے سے بار اپنا

اور جب بادشاہ کا ذکر آیا تو مصحفی نے عین موقع پر یہ قطعہ پڑھا، قطعہ

مجلس میں کیجے چاہیے جھگڑا شعرا کا — ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا — اکبر تیں بادشاہ جہانگیر کے آگے

بہرکیف ع درمیان ما و جاناں ماجرائے رفت رفت "

آزاد نے اس حکایت کی یوں ترجمانی کی ہے :-

" مرزا عظیم بیگ ایک دن میر ماشاء اللہ خاں کے پاس آئے اور غزل سنائی کہ بحر رجز میں تھی مگر ناواقفیت سے کچھ شعر رمل میں جا پڑے تھے، سید انشا بھی موجود تھے تاڑ گئے۔ حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا کہ میرزا صاحب آپ اس کو مشاعرے میں ضرور پڑھیں۔ مدعی کمال کہ مغز سخن سے بے خبر تھا اس نے مشاعرۂ عام میں غزل پڑھ دی۔ سید انشا نے وہیں تقطیع کی فرمایش کی اس وقت اس غریب پر جو کچھ گزری سو گزری مگر سید انشا نے اس کے ساتھ سب کو لے ڈالا اور کوئی دم نہ مار سکا بلکہ ایک مخمس بھی پڑھا جس کا مطلع یہ ہے -

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے الخ

اگرچہ مرزا عظیم بیگ نے بھی گھر جا کر اسی مخمس کی طرح میں اپنی بساط بموجب دل کا بخار نکالا، مگر وہ مشت بعد از جنگ تھی، چند بند اس کے انتخاباً لکھتا ہوں۔

ے وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم الخ

اب سید انشا کے طائر فخر کی بلند پروازی اور بھی زیادہ ہوئی۔ ہر غزل میں مضامین فخریہ کا جوش ہونے لگا۔ یہاں تک کہا کہ میرا اور ان لوگوں کا کلام ایسا ہے جیسے کلام الٰہی اور مسیلمہ کذاب کا۔ الفیل ما الفیل۔

مشاعرے میں بادشاہ بھی اپنی غزل بھیجا کرتے تھے اور بادشاہوں کا کلام جیسا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ سید انشا نے حضور میں عرض کی کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں۔ بادشاہ اگرچہ ان خانہ زادانِ قدیم پر ہر طرح قدرت رکھتے تھے۔ مگر اتنا کیا کہ مشاعرے میں غزل بھیجنی موقوف کر دی۔ یاروں کو بھی خبر لگ گئی نہایت رنج ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد جو مشاعرہ ہوا اس میں کمریں باندھ کر آئے اور ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا۔

ے مجلس میں چکے چاہیے جھگڑا شعرا کا۔ الخ مرزا عظیم بیگ نے کہا، بابا میں نے اپنی عرض حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر قناعت کی ہے کہ ابھی تضمین ہو گیا۔

ے عظیم اب کہ ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا الخ

دریائے مواج کے آگے گھاس پھوس کی کیا حقیقت تھی، سید انشا غزل فخریہ کہہ کر لائے تھے وہ پڑھی جس کا ہر شعر دلوں پر توپ گولے کا کام کرتا تھا ے

اک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے الخ

بعد ان کے قاسم کے سامنے شمع آئی۔ انھوں نے اتنا کہا کہ سید صاحب نے ذرا اس الفیل ما الفیل کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ میر مشاعرہ کو خیال ہوا کہ سید انشا کی ہجو کہی ہوگی مبادا شرفا میں بے لطفی حد سے بڑھ جائے اسی وقت اٹھے کہ دونوں میں صلح کروا دی سید انشا نے بھی شرافت خاندانی اور علو حوصلہ کا کام کیا۔ اٹھ کر حکیم صاحب کے گلے لپٹ گئے اور کہا کہ حضرت حکیم صاحب آپ میرے نبی عم اس پر صاحب علم صاحب فضل خاک بدہنم۔ بھلا میں آپ پر طنز کروں گا۔ البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خواہ مخواہ بد دماغی کرتے ہیں۔ اور داد دینی تو درکنار شعر پر سر تک نہیں ہلاتے۔ آخر کس برتے پر۔ غرض کہ سب کی صلح پر خاتمہ ہو گیا"

آزاد نے اپنے ترجمے میں حسب ذیل تصرف کئے ہیں۔

(۱) واقعات اپنی ترتیب میں مقدم و موخر ہو گئے ہیں لیکن اس طرح کہ نفس مضمون کو نقصان نہیں پہنچتا۔

(۲) آزاد کو وہ غزل نہ مل سکی جو انشا نے پڑھی تھی سو اس کی جگہ ایک اور فخریہ غزل لکھ دی جس میں تعلیاں تو ہیں لیکن بحر بیکراں ذیل بیاباں اور الم ترکیف والفیل ما الفیل والی تعلیاں نہیں۔

(۳) مذکورہ کے شروع سے آخر تک دو جماعتوں میں ہے، جن میں سے ایک طرف قاسم اور فراق اور عظیم تھے اور دوسری طرف انشا اور برکت اور مشتاق چنانچہ قاسم نے سب جگہ جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں مثلاً

۱؎ رفتہ رفتہ ناخوشی صاحباں بمرتبہ رسید۔ ۔ ۔ می کردند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میزدند نمودند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انشا دمی فرمودند۔

ٹ۲ روزے بعرض اعلیٰ اقدس .... رسانیدند ۔

ٹ۳ ایشاں باز معروض داشتند کہ ما ہیچ ایں بے ادباں خواہیم کرد ۔

ٹ۴ ایں بزرگاں ...... انشا دغزلیات مخرب آغاز نہادند ۔

ٹ۵ با ایں صاحباں و محب مہرباں از جائے خود جستہ بجائے ما رسیدہ ......

بہ سینۂ ہر یک چسپیدہ ۔

اس کے برخلاف آزاد کا ترجمہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معرکے میں ایک طرف صرف انشا تھے اور دوسری طرف قاسم اور عظیم ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انشا معاصر شعرا سے خواہ مخواہ لڑتے تھے ۔ اس لئے ہر ایک ان سے لڑنے میں حق بجانب تھا ۔

(۴) آزاد لکھتے ہیں کہ " میر مشاعرہ نے دونوں (قاسم اور انشا) میں صلح کرا دی ۔ اس طرح قاسم کو غیر متوقع اور غیر مناسب عزت دے دی ہے ، حالاں کہ ایک جماعت کے ہر فرد نے دوسری جماعت کے ہر فرد سے معانقہ کیا تھا اس میں حکیم صاحب کی کوئی خصوصیت نہیں تھی کیونکہ انشا کے دلی آنے سے پہلے اُردو کے چوٹی کے شاعر وہاں سے نکل چکے تھے صرف دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر مثلاً فراق ۔ قاسم ۔ ہدایت ، شکیبا ، عظیم ، منت ۔ محب ۔ وغیرہ وہاں رہ گئے تھے ۔ یہ انشا کی قدر کیا پہچان سکتے تھے ۔

" غریب الوطن نوجوان کو بے رفیق و بے یار سمجھ کر ان بے مایہ کہن سال مشاقوں نے کچھ تعریفیں کیں یا یہ کہ مشاعرے میں اس بلند نظر کے حسب لحاظ اس کے کلام کی عزت نہ ہوئی ۔ بہر حال سید انشا کو شبہہ ہوا کہ میری مخالفت پر سب دلی والے موافق ہو گئے ۔ اگرچہ یہ بزرگ بھی پرانے مشاق تھے ۔ مگر وہ نوجوان شہباز جس کے

سینے میں علوم و فنون کے تودے بھرے تھے اور طراری اور براقی کے باز و اڑائے لئے جاتے تھے کسی کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ خدا جانے طرفین نے زبان سے کیا کچھ کہا ہو گا۔

لیکن یہ باتیں کچھ نئی نہیں۔ شعرا کی مجلسوں میں ایسا ہوتا آیا ہے۔ ع بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن، مشہور مثل ہے۔ دلی میں عظیم بیگ اور انشا میں جو معرکے ہوئے ان کا ذکر قاسم کے سوا کسی اور معاصر تذکرہ نویس نے نہیں کیا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ان تذکروں میں شعرا کے معرکوں کا ذکر ہی نہیں بلکہ ایسے کئی معرکوں کا ذکر تذکروں میں آیا ہے؛ مثلاً:-

مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں بقا کے سودا اور میر کے ساتھ معرکوں کو قابل ذکر سمجھا لیکن عظیم اور انشا کے معرکے کا ذکر نہیں کیا۔

ابراہیم اور لطف نے بھی بقا اور سودا و میر کے معرکوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن عظیم اور انشا کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا۔ صرف سودا اور بقا کا ذکر دستور الفصاحت میں بھی ملتا ہے۔

بقاء اللہ خاں بقا۔ "شاعر قصیدہ گو، گزشتہ، لہذا بمقابلہ مرزا محمد رفیع در قصاید جوابش دادہ معنی یابی و تلاش بہم عزیب دادہ" ص۸۰ خاتمہ

مصحفی عظیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ "دعوے شاعری خیلے در دماغش جا داشت، ہیچ کس را بہ خاطر نمی آورد۔ و خود را از ہمہ ممتاز می دانست با آں کہ ہیچ علم و فن ندارد۔ مرد سپاہی پیشہ است"

ابراہیم و لطف نے صرف اسی قدر لکھا کہ "محمد عظیم از شاگردان مرزا

رفیع سودا است شنیدہ شد در دہلی بسر می برد" بس اس سے زیادہ اس کے احوال کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اسی تذکرے میں شورش کے متعلق لکھا ہے کہ "میرے آشنا تھے اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے" کمترین کے متعلق لکھا ہے کہ "طبعش اکثر مائل ہجا بود۔ گویند شہر آشوبے در ہجو ہر قوم گفتہ"

ضاحک کے متعلق لکھا ہے کہ "در ہزالی و ہزل گوئی اقتدار دارد"

مصحفی ضاحک کے متعلق لکھتے ہیں کہ "شخصے قابل و ظریف الطبع بود مزاجش بہ طرف ہزل گوئی بیشتر راغب با مرزا رفیع مکابرہ ہم در پیش آمدہ چیزے او و چیزے او در حق یکدیگر از قسم ہجویات جا دیدہ اند"

حاصل یہ کہ مشاعروں کے معرکے دستوری چیز تھے۔ اس لیے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور وہ قابل ذکر اسی وقت ہوتے تھے، جب کہ واقعی ناگوار صورت اختیار کر لیتے تھے۔ انشا اور عظیم کے معرکے اگر فی الحقیقت شورش و ہنگامہ آرائی کا باعث ہوتے تو معاصرین اس کا ضرور ذکر کرتے اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہے کہ جو شخص جس عیب میں مشہور ہوتا تھا اس کا ذکر تذکرہ نگار کسی قسم کی رو رعایت کے بغیر کر دیتا تھا۔ انشا کے بذلہ سنج یا ہزال یا ہجو نویس یا بد دماغ یا مغرور ہونے کے متعلق قاسم کے سوا کسی نے کچھ نہیں لکھا اور آزاد چونکہ قاسم کے بڑے مقلد اور مترجم ہیں اس لیے انشا کی صحیح حیثیت معین کرنے کی بحث سے خارج ہیں۔

سکسینہ میر کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "آزاد نے اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص قاسم سے بغیر

جانچے ہوئے لیے ہیں "

قاسم کا انتقال سنہ ۱۲۴۶ھ میں ہوا اور شیرانی صاحب کا اندازہ ہے کہ انھوں نے اسّی ۸۰ سال کی عمر پائی اس لحاظ سے مصحفی نے جب اپنا تیسرا تذکرہ سنہ ۱۲۳۱ھ میں ختم کیا تھا تو قاسم کی عمر ستر برس کی تھی اور ابراہیم ولمف نے سنہ ۱۲۱۵ھ میں جب تذکرہ ختم کیا تو قاسم کی عمر پچاس برس کی تھی تعجب ہے کہ ان دونوں نے قاسم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قاسم کی حیثیت ایک طبیب سے زیادہ کی نہ تھی، خواہ وہ اپنے پیشے کے لحاظ سے جالینوس ہوں لیکن شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی پوچھتا نہ تھا اور حکیم صاحب کا یہ مسلک تھا کہ

(۱) اپنے زمانے کے ہر بڑے شاعر کی پہلے تعریف کرتے۔

(۲) پھر اس کے غرور اور نخوت کا ذکر کرتے۔

(۳) پھر کسی عامی یا معمولی درجے کے شاعر سے اس کی توہین کراتے۔

(۴) پھر یہ کہہ کر کہ میں انصاف پرست ہوں اور حق گو ہوں اس کی تعریف میں رطب اللساں ہو کر عام قارئین کو دھوکا دینے کے لیے اپنی نیک نیتی اور غیر جانب داری کا ثبوت دے دیتے۔ چناں چہ انھوں نے درد۔ سودا۔ میر۔ انشا۔ قائم وغیرہ کے متعلق یہی رویہ اختیار کیا ہے مثلاً

سودا۔ (۱) شاعرے بود فصاحت بیاں شیریں مقال بلاغت نشاں ....

(۲) نظر برآنکہ کلام اللہ تعالیٰ شانہٗ نیست در امکنہ متعددہ جائے سخن است و محمد بقا اکبر آبادی وفدوی پنجابی و ضاحک دہلوی ہجو ہائے رکیکہ و سے اشتعال ورزیدہ سزائے کردار نا ہنجارش (۳) کہ بے ایچ پیچ ہجو ہر کسے می پرداخت در گذارش

نهاده اند (۴) امّا با ایں ہمہ رائے نصفت آرائے قاسم ہیچمدان علی الرغم دیگر سخن
پردازان، جلد اوّل ص ۲۰۵

میر- (۱) میر تخلص، سخن سنج، طبع زکی، میر محمد تقی .... (۲) بنا بر نخوتش که
در سرش جا گرفته ازیں امر که فی الحقیقت فخرے است ابائے کلی بمیاں آرد از کبر
و غرورش چه برطرازم که حدے ندارد و از نخوت و خودسریش چه بنگارم که سینہ
قلم حقائق رقم می نگارد. بر شعر کسے گر ہمہ اعجاز باشد و کلام شیخ شیراز باشد سر ہم
نمی جنباند تا به تحسین خود چه رسد و به سخن احدے اگرچه بطرازے بود و گفته اہلی
شیرازی گوش ہم فرا نمی دارد امکان چیست که حرفے ازیں بر زبانش رود و در تذکرہ
خود ہمہ کس را به بدی یاد کردہ در فن شاعرشان علی التخلص ولی نوشته که وے شاعرے
است از شیطان مشہور تر (۳) و لیترا ایں کردار نا ہنجار از کمترین شاعر بلکه ہیچ پایه
کردے ہجو ہائے متعدد ادا کردہ که بعضے ازاں بغایت رکیک پردہ در افتادہ و قطع نظر
از تذکرہ اژدر نامہ برشته نظم کشیده .... در مجلسے که اژدرنامہ انشا کرد....
محمد اماں نثار ...... در ہماں مجلس غزلے موزوں نمودہ بعد خواندن وے اژدرنامہ
را به درہ خود آں غزل را بیزار شدہ و مد انشاد نمودہ و در مجلس غوغائے عجیب و غریب
برخاست و به محمد تقی میر رسید آنچه رسید .... (۴) بہر حال
ازیں ہا گزشته می گویم و حق نمی پوشم الخ جلد دوم ص ۲۲۹

قائم- (۱) در بدو ریخته گوئی از خدمت ...... ہدایت ...... استفادہ
سخن می کرد ...... بعد چندے بجناب ...... خواجه میر درد ... توسل جست
(۲) و از مربی قدیم بجائے انحراف ورزید ... در ہمشاں آں تجرد نشاں نشاد

کرد کہ بحسر بودے بے سعادتی میدید . . . . بہرحال در آخر حال بجزیست . . . . . . سودا درپیوست وبنا برخباثت اصلی از شاگردیش ہم پہلو تہی می کرد (۳) مرزا ساقی نامہ در ہجویش گفتہ . . . . . (۴) وچشم از ناحق ناپوشیدہ می گوییم . . . . الخ جلد دوم ص ۸۲

انشا۔ (۱) مردیست ظریف الطبع، بزلہ گو، لطیفہ سنج، کشادہ رو، ہوشیار، یارباش لپسندیدہ پیراستہ (۲) اما آں کہ بے عیب ذات خدا است . . . . بنا بر مقتضائے بشری اندکے شوخ طبع وہنگامہ آرا وخود بین واقع شدہ دربلدۂ لکھنؤ بمشاعرۂ سلیمان شکوہ بہ میاں مصحفی کہ . . . . . . سلسلہ ہیچ بجائے طرف شدہ کہ کار از گفتگوئے رکیک . . . . . . بہجو گوئی کشید . . . . کہ حیا بہ تحریرش رخصت نمی دہد وقلم حقائق رقم غرق عرق انفعال می شود۔ (۳) پھر عظیم بیگ کے ساتھ معرکے کی مشہور داستان بیان کی ہے۔

(۴) اما از راستی نہ باید گذشت وحق نتوا ند پوشید، میر موصوف شاعرے است زبردست وسخن سنج است قوی بازو . . . . ۷۵ بیت از کلام صحت نظام او دریں جائے گاہ تحریر یافت۔

اور خود قاسم نے عظیم کے متعلق لکھا ہے کہ "فی الواقع شاعرے بود بسیار خوب اما نہایت برخود غلط" حکیم صاحب نے انشا اور عظیم میں جو معرکے ہوئے ان میں یہ کاگ بنایا ہے۔ حکیم صاحب نے انشا کی صفات میں یارباش اور صحبت دار کی صفتیں بھی لکھی ہیں اور یہ صفات خود بینی اور ہنگامہ آرائی کے منافی ہیں جو شخص ہنگامہ آرا وخود بین ہو وہ یارباش وصحبت دار کیسے ہوسکتا ہے۔ اور یہ دونوں

باتیں ایک جگہ کیونکر جمع ہو سکتی ہیں، البتہ اگر کوئی شخص ہنگامہ آرا اور خود بین ہونے کے ساتھ منافق اور ریاکار بھی ہو تو ظاہر داری اور مصلحت شناسی کے پردے میں یار باش اور صحبت دار ہو سکتا ہے۔ لیکن انشا کے خاندان، افتاد طبیعت، تعلیم و تربیت کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ غالب نے اپنا یہ شعر انشا ہی کے متعلق لکھا تھا۔

؎ ہم پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا ہرگز ⁂ غالب خاک نشین اہل خرابات سے ہے۔

اور جب حکیم صاحب عظیم کو نہایت بر خود غلط سمجھتے تھے تو غور کرنے کی بات ہے کہ اسے خواہ مخواہ انشا جیسے جید عالم اور مستند زباں داں اور وہبی شاعر کے مقابلے میں کیوں کھڑا کیا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ عظیم اور انشا کے معرکوں پر افسوس کریں بلکہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ انشا جیسے عالم اور شاعر کا میں ناطقہ بند کرنے ہی والا تھا کہ اس نے معافی مانگ لی تو بیڑا کیا درجہ ہوا یہ حکیم صاحب اپنے منہ میاں مٹھو بنے ہیں۔ ذرا اسلوب بیان قابل غور ہے کہ جب انشا نے حکیم صاحب سے مصالحت کر لی تو عظیم کے ساتھ انشا کے سلوک کو جائز قرار دے دیا۔

انشا کے مربی

(۱) الماس علی خاں

غلام قادر نے سنہ ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو اندھا کیا تھا، آب حیات میں لکھا ہے کہ اس فتنے کے بعد بھی انشا شاہ عالم سے متوسل رہے لیکن "دلّی میں بادشاہ اس وقت فقط شاہ شطرنج تھا، یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ غلام قادر نقد بصارت تک بھی لے گیا تھا ..... مگر یہ اپنا مطلب ہزار طرح سے نکال لیتے تھے۔ لیکن پھر کب تک، آخر دلی سے دل اچاٹ ہوا اور لکھنؤ کا رخ کیا" انشا نے الماس علی خاں بہادر کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں اس سیاسی انقلاب کا اور اس کی زد میں خود اپنے آ جانے کا ذکر کیا ہے۔

اندریں عہد اگر حضرت لقماں باشد ∴ بہر یک لقمۂ ناں تابع دوناں باشد
بدل با تجمل چہ رسد قرص جویں ∴ آہ ازاں شخص کہ از اہل صفاہاں باشد
وقت آنست کہ از گرسنگی جاں بدہد ∴ بادشہ زادہ کہ از اولاد تمرخاں باشد
شکر اللہ کہ دریں معرکہ ایں دلشو ∴ کا ندراں بو علی وقت ہراساں باشد
دست ہمچو من ناکارہ بگیرد شخصے ∴ کہ مجسم ہمہ چوں ابر بہاراں باشد

عزت و جمعیت انواع تفضل بخشد ٭ دز پئے ہر ذرہ ہم بر زدہ داماں باشد
ہر جہانے کہ ازاں صورت الماس بپا است ٭ جمع در نام ہماں مرد مسلماں باشد
یعنی الماس علی خان بہادر کہ مدام ٭ در جہاں دست سخایش گہر افشاں باشد

یہ قصیدہ سنہ ۱۲۰۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس قصیدے میں انشا نے الماس علی خاں کے بارے میں لکھا ہے ؎

چہل سال است کہ اوقات شریفش این ہست
کس ندیدم بعبادت کہ بدینساں باشد

پھر قطعۂ تاریخ رحلت الماس علی خاں میں لکھا ہے کہ :-

؎ شصت سال است کہ اوقات شریفش آں بود
آوخ آوخ زچنیں مرد مسلماں افسوس

الماس علی خاں کی وفات سنہ ۱۲۲۳ھ میں ہوئی جب کہ ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی اور اس لحاظ سے ان کی عمر سنہ ۱۲۰۲ھ میں چالیس برس کی ہوئی۔ پانچویں اور چھٹے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انشا لکھنؤ پہنچ کر پہلے الماس علی خاں سے متوسل ہوئے۔ سلیمان شکوہ دو برس بعد سنہ ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچے ہیں۔ انشا کے دلی سے لکھنؤ جانے کے وجوہ متعین کرنے میں ان کے کلیات کا پہلا قصیدہ بہت اہم ہے لکھتے ہیں :-

وسعت رزق تفضل ہو مجھے صحت ساتھ ٭ جلد ایسی کہ نہ کرنی پڑے مجھ کو زق زق
رزق کی تو نے تکفل کی قسم کھائی ہے ٭ ہے قسم تیری تو اوفی و ابر و اوفق
عمر تا یکصد و سی سال عنایت ہو مجھے ٭ لیک یہ شرط ہے اس شان سے ہو کچھ بق بق

تاکہ مشغول عبادت رہے انشاء اللہ ؛ ضائع اوقات کو کھویا نہ کرے حق ناحق
اپنے اطفال وعیال ویدر و مادر ساتھ ؛ روز و شب ورد و وظائف میں رہے مستغرق

سنہ ۱۱۹۶ھ میں ذوالفقار الدولہ کا انتقال ہو جانے کے بعد خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے شاہ عالم ایسے پریشان و عسیر الحال تھے اور دلی کے امرا کی ایسی نفسی نفسی کی حالت تھی کہ ان باپ بیٹوں کی طبابت بمشکل سے چلتی تھی اور یہ خاندان تنگ دست ہو گیا تھا۔ وجہ معاش پیدا کرنے کے لئے بہت زق زق اور بق بق کرنا پڑتا تھا اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے تو بے مایہ شعرا ان کے منہ آتے تھے، انھیں جواب دینے میں اوقات حق ناحق ضائع ہوتے تھے۔

ایک وقت اللہ کا کرم یوں ظاہر ہوا کہ الماس علی خاں کو قصیدہ سنا کر انشا گھر پہنچے، سواری سے اترے ہی تھے اور ابھی لباس تک تبدیل نہیں کیا تھا کہ فرزند ارجمند کی ولادت کا مژدہ سنا، اس واقعے کو لکھتے ہیں :-

از قضا ہم بست شرفہ دونیے کہ فال ساختم ؛ سوئے خانہ سر نمودم ہر کجے ورانہ بام
پس ہماں روزے ہماں ساعت ہماں لحظہ بہ غور ؛ جائے گہ تاگم کردہ بے قعود و بے قیام
تاکہ رہ واکنم خوش مژدۂ آمد بگوشش ؛ شد مبارکباد ہر سو گشت شایع ایں کلام
منجلی آئینۂ امید من شد واں مثال ؛ صورت آدم گرفت و در پذیرفت ارتسام
عمر باشد دودمانم بے چراغ افتادہ بود ؛ زیں تاسف دود میخواست از راہ مشام
بود انشاء اللہ اینک حق تعالیٰ از کرم ؛ داد فرزندے بمن او را تعالیٰ کرد نام

پھر لکھتے ہیں کہ اگر فارغ البال ہوتا تو کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیجتا۔ غریب شاعر

لہ اس تفصیل کے لحاظ سے تعالیٰ اللہ خاں سنہ ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

ہوں اس لئے اس کے عوض یہ قصیدہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔

داستی این است گر حال بدرستے داشتم ٭ می فرستادم بجذمت چیزکے آش و طعام
چوں چنیں ہا ہیچ ہیچے لائق و موقع بنود ٭ کردم انشاایں قصیدہ آمدم بہر سلام

نواب الماس علی خاں بہادر زوجہ نواب شجاع الدولہ نواب بہو بیگم کے ساتھ جہیز میں آئے تھے اور تمام خواجہ سراؤں میں ممتاز تھے۔ آصف الدولہ کے زمانے میں دوآبہ کی حکومت ان کے سپرد تھی۔ ولزلی سنہ ۱۲۱۱ھ میں رزیڈنٹ لکھنؤ کو لکھتا ہے کہ "الماس علی خاں کو جو اختیارات دوآبے میں حاصل ہیں وہ سرکار کمپنی کو حاصل ہوجائیں اور اس کے عوض میں زرموعود میں تخفیف کی جائے، اس کے مرنے کے وقت تم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی دوسرا اس کا قائم مقام مثل اس کے صاحب لیاقت اور عالی حوصلہ اور صاحب تدبیر مقرر کیا جاتے تو ملک کے اندر فساد برپا ہوجانے کا اندیشہ ہے" اس سے الماس علی خاں کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے اور اگر یمین الدولہ نے انگریزوں سے خفیہ معاہدہ نہ کیا ہوتا تو دوآبے پر ان کا قبضہ محال تھا۔ الماس علی خاں کے اس اقتدار کے زمانے میں انشاؔ نے ان کے ساتھ دوآبے کا دورہ کیا ہے "بعد چندے کہ ہمراہ الماس علی خاں بہادر وارد سندیلہ شدم"۔ دریائے لطافت ص۴۲

گورنمنٹ انگریزی کو آدھا ملک سپرد کئے جانے کے بعد الماس علی خاں لکھنؤ میں رہ گئے ان کی دولتمندی تمام اہل لکھنؤ سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی عالی ہمتی مشہور زمانہ تھی۔ کروڑوں روپیہ ان کے پاس تھا، کلکتہ، حیدرآباد بمبئی، راجپوتانہ وغیرہ میں ان کی کوٹھیاں جاری تھیں، اور لاکھوں روپیہ ان کا

امرائے لکھنؤ پر قرض تھا، مرض الموت کے قریب ایسی دستاویزیں جلا دالیں تاکہ یمین الدولہ سعادت علی خاں ان کا روپیہ وصول نہ کرے۔ یمین الدولہ نے سرفراز الدولہ کو جب موقوف کر دیا تو یہ اپنی جیب سے روزانہ ہزار روپے خرچ کے لئے دیتے تھے۔ حال یہ کہ مال داری اور اقتدار میں یمین الدولہ سے بڑھ کر تھے اور ان کے کسی متوسل کی ان کی زندگی میں خفیف سی دل آزاری کرنا بھی یمین الدولہ کے بس کی بات نہیں تھی۔

انشا اپنے زمانے کی سیاسی جماعتوں کے سربرآوردہ افراد کے دوست ملاقاتی اور دعاگو تھے۔ اور انہیں ان جماعتوں کے افراد کی باہمی مخالفتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا سنہ ۱۲۲۲ھ میں یمین الدولہ کی فرمائش سے دریائے لطافت لکھی ہے لیکن اس میں یمین الدولہ کے بہت سے سیاسی حریفوں کا ذکر ہے اور نہایت احترام سے ان کے نام لئے ہیں۔ شاہ عالم، الماس علی خاں، نواب بہو بیگم کے تین بھائی، ان سب کا ذکر اس میں آیا ہے۔ شاہ عالم نے یمین الدولہ کو صوبہ اودھ کی وزارت کی سند نہیں دی اور یمین الدولہ نے انتقاماً سات ہزار روپے ماہانہ کا ہدیہ بند کر دیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن انشا نے شاہ عالم کے نام کے ساتھ "حضرت ظل سبحانی، خلیفۂ رحمانی، شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہٗ و افاض علی العالمین برہٗ و احسانہٗ" صـ۱۳ لکھ کر ان کے احسانات کا برابر حق ادا کیا ہے۔ یمین الدولہ انتقامی طور پر اس کی کوشش میں ہے کہ اودھ کی سند وزارت کو تمغۂ حکومت یعنی شاہی میں تبدیل کر دے اور انشا شاہ عالم کے متعلق لکھتے ہیں کہ "بادشاہ ہندستان کہ تاج فصاحت بر سر او می زیبد صـ۶۴ اور اگر یمین الدولہ کی فصاحت اور بلاغت کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف بندیل کھنڈ کے عماد الملک کی گفتگو سے" سردفتر فصحائے ایں

زبان .... دریں زبان ذات .... جناب عالی است ......
...... دیگر نواب عماد الملک مغفور کہ موجد بعضے قوانین ایں زبان است بجا دش ہمہ مقبول لیکن نسبت قوت طبع او بہ قوت طبع جناب عالی نسبت چاہ است با دریا،
الخ ص۳۸-۳۷ دریائے لطافت) اور الماس علی خاں کی وفات کی تاریخ لکھی ہے۔ جنھوں نے سعادت علی خاں کے معتوب سرفراز الدولہ کی روزانہ ہزار روپے سے دستگیری کی تھی اور وفات سے پہلے کل دستاویزیں جلا دی تھیں کہ یمین الدولہ نواب کو وصول نہ کرنے پائے۔

نواب بہو بیگم اور سعادت علی خاں کی ناچاقیاں ظاہر ہیں پھر بھی انشا نے ان کے باپ اور تین بھائیوں کو لکھنؤ کے فصحا کے ذکر میں سعادت علی خاں کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ "دیگر از فصیحان محمد اسحٰق مؤتمن الدولہ دوم پسر شش نجم الدولہ و افتخار الدولہ نواب مرزا علی خاں و نواب سالار جنگ" ص۲۳

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انشا کا تعلق کسی خاص جماعت سے نہیں تھا اور یمین الدولہ کی بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ انھیں کہیں آنے جانے سے روکے ان رکاوٹوں کا تھوڑا بھی شائبہ ہوتا تو ایسے کئی امرا موجود تھے جو انشا کی کفالت کر سکتے تھے مثلاً صرف الماس علی خاں ان کی کفالت کے لئے کافی تھے پھر سلیمان شکوہ موجود تھے جن کے دربار کا توسل ممکن ہے کہ انشا نے شاہ عالم کے احترام کی وجہ سے قبول کر لیا ہو۔ انشا کے یمین الدولہ کے ہاں نوکر ہونے کا ثبوت صرف دو روایتوں سے ملتا ہے۔ پہلی آزاد کی روایت کہ علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے یہ سعادت علی خاں کے ہاں پہنچے اور

دوسری انشا کا یہ شعر۔

بدوں حکم وزیر الممالک اے آغا
چساں کنم حرکت نوکریست اشا یا بازی

یمین الدولہ خود سنہ ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ آئے اور مسند نشین ہوتے ہی علامہ کو کلکتے بھیج دیا۔ انشا نے سعادت علی خاں کے جلوس کا قصیدہ کہا ہے۔ ان کی بیشتر عمر شجاع الدولہ اور شاہ عالم کے درباروں میں گزری ہے اور ان خاندانوں کے افراد سے نہایت قریبی تعلق رہا ہے۔ علاوہ انشا کی فطرت اس کی محتاج نہیں تھی کہ اگر وہ کسی صاحب اقتدار تک رسائی حاصل کرنا چاہیں تو کوئی ان کی سفارش کرے۔ ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہ کو خواہ مخواہ کیوں واسطہ بنایا گیا" وہ اپنے علم اور حسن تدبیر سے ادھر معتمد سرکار انگریزی کے ادھر رکن سلطنت لکھنؤ کے اور مشیر تدبیر سعادت علی خاں کے تھے۔ وہاں سید انشا بھی جایا کرتے تھے اور وہ بھی ان کی لیاقت اور خاندان کے لحاظ سے پہلو سے عزت میں جگہ دیتے تھے اور اس فکر میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت نکالیں" الخ۔ آب حیات۔

انشا کے مجمل شعر کی تفصیل یہ ہے الماس علی خاں کا انتقال سنہ ۱۲۲۳ھ میں ہوا۔ اس وقت تک انشا جیسے یمین الدولہ سے بے تکلفی سے ملتے تھے ایسے ہی دوسرے امرا سے بھی ان کی ملاقاتیں تھیں۔ یہ یمین الدولہ کے ہم نوالہ و ہم پیالہ اور نہایت ہی مقرب مصاحب تھے اور وہ بھی ان کے ساتھ ہر طرح کا سلوک کرتے تھے اور جب تک الماس علی خاں زندہ تھے نواب کی یہ

ہمت نہیں تھی کہ انشا کو اپنے مخالفوں سے ملنے سے روکیں۔

ان واقعات تاریخی اور تذکرہ نگاروں کی شہادتوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ سنہ ۱۲۱۵ھ تک انشا سلیمان شکوہ سے متوسل رہے اور اسی مدت میں یمین الدولہ سے بھی (ان کے قصائد اور کلام سے ثابت ہے) ان کے تعلقات اچھے رہے لیکن سنہ ۱۲۱۵ھ کے بعد ہم عمری اور بے تکلفی کی بنا پر ممکن ہے کہ یمین الدولہ کے ہاں ان کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی ہو اور نواب نے بھی انھیں چوبیس گھنٹے اپنے ہی ساتھ بسر کرنے پر مجبور کیا ہو۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انشا نے سنہ ۱۲۱۵ھ سے پہلے سلیمان شکوہ کی مصاحبت ترک کر کے یمین الدولہ کی نوکری قبول کر لی تھی، یہ کسی کے بھی نوکر نہیں تھے۔ سب ان کے ساتھ برابر کا سلوک کرتے تھے۔

سعادت علی خاں کی زندگی ہمارے سامنے ہے، نہ وہ خود عالم تھے اور نہ علما ان کے دربار سے متوسل تھے۔ انشا سے صرف مصلحت وقت سمجھ کر ملتے تھے۔ اور اس میں ان کی سیاست کو بہت بڑا دخل تھا۔ ان کی زندگی کے واقعات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں برس سے چودھویں برس تک دو سال شاہ عالم کے ساتھ گزارے۔ باقی عمر بریلی۔ہنڈول۔ بیانہ، بنارس وغیرہ اضلاع اور شہروں میں گزری۔ اس مدت میں ان کو نہ تحصیل علم کا موقع ہاتھ آیا اور نہ ان کی تعلیم کا کوئی درست انتظام ہو سکا، صفدر جنگ، شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی اولاد اور اس زمانے کے کئی امرا اور ان کی اولاد کا ذکر شعرا یا صاحب لیاقت لوگوں کے ضمن میں تذکروں میں ملتا ہے لیکن سعادت

تذکروں میں سے مصحفی کے تین تذکرے اور ابراہیم و لطف کے تذکرے اور قاسم کا تذکرہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ کہیں بھی کسی علمی یا ادبی سلسلے میں یمین الدولہ کا نام نہیں ملتا۔

سیاسی مصلحتوں کے بغیر ایسے شخص کو انشا سے ملنے جلنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ انشا جیسے عالم و فاضل سے پھکڑپن اور رندی کے سوا کسی چیز کی فرمائش ہی نہ ہوتی تھی۔ اس کا ثبوت وہ ساری تصانیف ہیں جو یمین الدولہ کے حکم سے انشا نے لکھی ہیں۔ دریائے لطافت کی فحش مثالیں یمین الدولہ کے مذاق کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مثنوی فیل بھی انہیں کے حکم سے لکھی گئی تھی۔

درحقیقت بات اتنی تھی کہ الماس علی خاں کا مرنا تھا کہ بتدریج نواب نے انہیں بیجا رکھنا شروع کیا۔ سلیمان شکوہ خود وظیفہ یاب تھے۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔ انشا کبھی کسی سیاسی فریق کے رکن بننا نہیں چاہتے تھے ورنہ نواب کے مقابلے کے لیگ کرنل بیلی، مرزا جعفر وغیرہ موجود تھے۔ الماس علی خاں کے انتقال کا انشا کو اس قدر صدمہ ہوا کہ سنہ ۱۲۲۳ھ کے بعد غالباً انھوں نے لکھنے پڑھنے کا کام مطلق ترک کر دیا تھا۔ اس سنہ کے بعد کی کوئی تحریر نظم ہو یا نثر نہیں ملتی اور پھر انہیں دنوں میں ان کا تقریباً بیس یا بائیس سالہ نوجوان بیٹا مر گیا۔ یہ صدمہ خود انشا کو دنیا سے متنفر اور گوشہ نشین کر دینے کے لئے کافی تھا۔ علاوہ اس کے الماس علی خاں کے متوسلین سے یمین الدولہ انتقام لینا چاہتے تھے، جیسا کہ کئی اور لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک تھا۔ انشا کی عزت اور وضعداری پیٹ کی خاطر اپنے ولی نعمت شجاع الدولہ کی اولاد کے خلاف کوئی محاذ قائم کرنے

کی روادار کیسے ہو سکتی تھی۔ انھوں نے پابندیاں قبول کر لیں، ورنہ اس زمانے کی سیاسی حالت اور لکھنؤ کے ماحول پر نظر کرتے ہوئے یمین الدولہ کا انشا جیسے شخص کو مجبور کرنا اور انشا کا اس جبر کو قبول کر لینا نہایت بعید از قیاس امر ہے یمین الدولہ نے انشا پر جو سختیاں کیں اس کی وجہ غالباً سیاسی ہے اس میں انشا کی فرضی بے اعتدالیوں کا کوئی دخل نہیں، یمین الدولہ نے صرف اتنا کیا ہوگا کہ انشا کو گھر سے باہر نکلنے سے منع کر دیا ہوگا۔ انشا کو کوئی اور تکلیف یا پابندی نہیں تھی۔ ورنہ معاصرین میں سے انشا کے دوست تاسف سے اور دشمن طنزیہ اس کا ذکر کرتے اور کوئی بدسلوکی انشا سے نہ کیے جانے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ قاسم نے انشا کی آخری انسانوی حیثیت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

انجب کا لطیفہ غالباً آزاد کا گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس تخلص کا ایک شاعر گزرا ہے اور مصحفی کے فارسی تذکرے "عقد ثریا" میں سب سے پہلے اسی شاعر کا ذکر ہے۔ پھر انشا نے بھی مصحفی میں اپنے متعلق کہا ہے کہ "من سید کرزا ولاد حسین است و نجیب الطرفین است الخ" شاید اسی سے آزاد نے ایک لطیفہ پیدا کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی،

(۲) یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں

نواب اور انشا کے تعلقات میں کشیدگی کے اسباب سب سے پہلے آزاد نے معیّن کیے اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے انھیں کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا۔ غرض یہ داستان جس کسی نے بھی دہرائی ہے اس کا ماخذ آب حیات ہے۔ کشیدگی کے اسباب کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) نواب فطرۃً منقبض اور انشا طبعاً ہنسوڑ تھا۔ اس لیے ان دونوں میں نباہ ممکن نہ تھا

(۲) انشا کے مزاج میں شدت کی بے اعتدالی تھی۔

(۳) انشا کی تعلیاں نواب کو بعض اوقات ناقابل برداشت ہوتی تھیں۔

(۴) انشا جوش تقریر میں عمداً یا سہواً ایسے لفظ بول جاتا تھا جن میں تعریف توہین دونوں کے پہلو ہوتے تھے۔

جب تک ان روایتوں کو درایت اور واقعات تاریخی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا نہ جائے کسی ایسے نتیجے پر پہنچنا جو صرف سنی سنائی باتوں سے نہ اخذ کیا گیا ہو بلکہ حقیقت سے بھی عین مطابق ہو محال ہے۔ اس لئے کشیدگی کے ان چار بنیادی وجوہ کا جائزہ لیے بغیر کوئی نتیجہ اخذ کرنا محض اندھا دھند تقلید ہوگا، اور یہ تحصیل حاصل ہے کیوں کہ ان وجوہ کی تقریباً نصف صدی سے اس قدر تقلید کی گئی ہے کہ گویا ہمارا اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے اور سیاسی تاریخ کے پس منظر

کو نظر انداز کر کے نواب کی طبیعت کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کر دینا قطعاً مغالطہ انگیز ہوگا۔ انشا اور نواب میں کشیدگی کے روایتی اسباب کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں پہلے ان سوالات کے جواب نہایت احتیاط سے فراہم کرنے چاہئیں کہ :۔

(۱) کیا واقعی نواب ایک غیور، متین، سنجیدہ، باوقار اور منتظم شخص تھا۔

(۲) کیا واقعی انشا ایک غیر سنجیدہ، مضحک، منہ پھٹ، دل آزار اور بر خود غلط شخص تھا۔

ان کے صحیح جواب اسی وقت دیے جا سکتے ہیں جب کہ ہمارے پیش نظر ان میں سے ہر ایک کی تربیت، طبیعت کی افتاد، اور ماحول کا بہت ہی واضح نقشا موجود ہو۔ میں نے نواب اور انشا کے جو حالات تاریخ اودھ اور اردو ادب کی تاریخوں سے مرتب کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں ولادت سنہ ۱۱۷۱ھ میں ہوئی۔ تقریباً انشا کے ہم عمر تھے سنہ ۱۱۸۳ھ میں جب شاہ عالم الٰہ آباد آئے تو شجاع الدولہ یمین الدولہ کو ساتھ لیے خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت یمین الدولہ کی عمر بارہ برس کی تھی بادشاہ نے کہا کہ یہ لڑکا باپ کی طرف سے بہ نیابت وزارت حاضر دربار شاہی رہا کرے چنانچہ شجاع الدولہ یمین الدولہ کو بادشاہ کے پاس چھوڑ فیض آباد آئے۔ جب شاہ عالم الٰہ آباد سے دلی گئے تو سنہ ۱۱۸۵ھ میں شجاع الدولہ بھی ملاقات کے لیے گئے اور یمین الدولہ کو واپس لائے سنہ ۱۱۸۸ھ میں جب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو نواب سعادت علی خاں بریلی وغیرہ کی حکومت پر مامور تھے۔ مختار الدولہ نے ریذیڈنٹ سے کہا کہ یمین الدولہ کا قیام بریلی میں

آصف الدولہ کی رائے کے خلاف ہے کیوں کہ ایک غلاف میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اس لیے ریذیڈنٹ نے یمین الدولہ کو بریلی سے لکھنؤ بلا لیا اور اس سلوک کے عوض آصف الدولہ نے ملک بنارس سرکار انگلشیہ کو دے دیا۔ اٹاوہ میں میاں بسنت خواجہ سرا کے ہاتھ سے مختار الدولہ قتل ہوئے اس میں یمین الدولہ کا ہاتھ تھا بنظر دور بینی و احتیاط یہ آصف الدولہ کے لشکر سے بھاگ کر بمقام ڈیگ ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے پاس پہنچے انھوں نے علاقہ ہنڈول بیانہ وغیرہ جس کی آمدنی سات لاکھ روپے سالانہ تھی یمین الدولہ کے ذاتی مصارف کے لیے مقرر کر دیا۔ چار برس تک یمین الدولہ مقام مذکور رہیں نجف خاں سے متوسل رہے اس مدت میں کئی معرکوں میں نجف خاں کا ساتھ بھی دیا۔ بعض مقامات میں فتوحات نمایاں بہم پہنچائیں کبھی شکست کھا کر دشمن کے مقابلے سے نہیں لوٹے مگر باوجود اس تمام کامیابی کے اس مقام میں دل نہ لگتا تھا، اس وجہ سے باستصواب نواب گورنر جنرل نجف خاں سے علیحدہ ہوکر لکھنؤ آئے اور چند روزہ قیام کے بعد حسب ایمائے گورنر جنرل بنارس میں قیام کیا یہ واقعہ سنہ ۱۱۹۱ھ کا ہے۔

سنہ ۱۱۹۱ھ میں یمین الدولہ کی عمر بیس برس کی تھی اور یہ بتدریج غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جانے والے ہندستان کی آزادی کے لیے اپنے ہم عصر نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کی طرح مردانگی اور تدبر کے جوہر دکھانے کا زمانہ تھا لیکن اس نوجوان نے انگریزوں سے ساز باز اور وارن ہیسٹنگز سے اپنی انگریز پرستی کا صلہ کر کے سالانہ تین لاکھ روپیہ دربار اودھ سے وظیفہ لیا اور بنارس میں بیس برس تک آصف الدولہ کی موت کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

اور اس زمانے کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے رعایا کی بہبود و ترقی اور سب سے بڑھ کر آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں صرف ہونے کے قابل عمر کے بہترین بیس برس جس شخص نے کاہلی اور تعطل میں برباد کر دیے ہوں اس کی نفسیات کیا ہوگی، اس مدت میں اس نے اپنے وظیفہ میں سے چالیس لاکھ روپے پس انداز کر لیے تھے۔ اور یہی کارنمایاں ہے جو بیس برس کے عرصے میں ہوا۔

سنہ ۱۲۱۲ھ میں یمین الدولہ نے آصف الدولہ کے فرزند نواب وزیر علی خاں کو جو باپ کے انتقال کے بعد مسند نشین ہو گیا تھا، معزول کرانے اور خود مسند حاصل کرنے کے لئے سر جان شور گورنر جنرل سے ستاون لاکھ کی جگہ پچھتر لاکھ روپے کمپنی کو خراج اور آدھا ملک دینے کا بنارس میں (یہ وہی زمانہ ہے جب کہ "سلطنت خداداد" کا سرنگاپٹن میں نیل ڈھل چکا تھا) سودا کیا، چار سال کے بعد سنہ ۱۲۱۶ھ میں کمپنی نے آدھے ملک پر اپنا پورا قبضہ کر لیا) مسند نشینی کے بعد شاہ عالم نے نواب کو صوبہ اودھ کی سند اور فرمان وزارت دینے سے انکار کر دیا اور نواب نے انتقامی طور پر سات ہزار روپے ماہوار کا ہدیہ دینا بند کر دیا۔

سنہ ۱۲۱۳ھ میں نواب بہو بیگم یمین الدولہ کی گستاخی اور بے ادبی سے ناراض ہو کر لکھنؤ سے فیض آباد چلی گئیں۔ یہ جب کبھی نواب عالیہ کی علالت کی خبر سنتے تھے تو فیض آباد کے گرد و نواح میں شکار کھیلنے کے بہانے پہنچ جاتے تھے کہ اگر وہ مر گئیں تو ان کی دولت پر قبضہ کر لیں۔ ایک وقت یہ عیادت کے لئے گئے تھے تو اپنی آنکھوں نواب عالیہ کے تلووں سے ملی تھیں، صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ پاؤں پر ورم ہے یا نہیں۔

نواب اور رعایا کے تعلق کے بارے میں خود نواب کا بیان موجود ہے وہ ولزلی کو لکھتے ہیں کہ :-

" نہ میں رعایا سے خوش ہوں نہ رعایا مجھ سے، سپاہ میری وفادار ہے نہ فرماں بردار۔ رعایا اور سپاہ دونوں سرکش اور فساد اندیش، اس لئے مجھے سلطنت سے نفرت ہے، میں اس بارِ سلطنت کو سر پر نہیں اٹھا سکتا، اور خلق جو ودیعت الٰہی ہے اس کی خبر گیری اچھی طرح نہیں کر سکتا؛ میں تو سلطنت چھوڑتا ہوں اور مجھے اس کا یقین ہے کہ سرکار انگلشیہ میرے بیٹے کو میرا جانشین کرے گی جس سے میرا نام آئندہ باقی رہے گا، اور میرے خویش دبے گاؤں کا وظیفہ کلی کر دے گا، جس سے ان کا گذارہ اچھی طرح ہو سکے گا؛ میرے پاس جو کچھ سرمایہ ہے وہ زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہے، میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا "

جس سند کو حکومت کو لٹا کر حاصل کیا گیا تھا، اس سے پہلے ہی سال بڑا یہ دل برداشتگی۔

ولزلی نے جواب دیا کہ میں فرزند کی تخت نشینی اور خزانہ کی حوالگی کی شرطیں نہیں مان سکتا تو یمین الدولہ نے تخت سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اس پر ولزلی لکھنؤ کے ریزیڈنٹ سکوٹ کو لکھتا ہے۔

" میں نواب کی دو رنگی اور مکاری سے بہت ناراض ہوا (۹ دسمبر سنہ ۱۷۹۹ ع)

اوپر کے مکتوب میں خط کشیدہ جملے یمین الدولہ کا سخن تکیہ تھا
ولزلی کے پاس نواب کی کوئی حقیقت نہیں تھی سنہ ۱۷۹۹ء / ۱۲۱۳ھ

میں اس لئے رزیڈنٹ کو اپنے سکرٹری سے لکھوایا تھا کہ :۔

" نواب کا خط واپس بھیجا جاتا ہے وہ تم نواب کو دے دو اور ہماری طرف سے سنا دو کہ اس دفعہ اس نے جو طرز اختیار کیا ہے وہ نہایت بے باکانہ ہے اور سلطنت انگلشیہ کا ادب تعظیم جو اس پر واجب ہے اس نے اس سے قدم باہر رکھا ہے اس لئے گورنر جنرل جواب لکھنے پر کچھ توجہ نہیں فرماتے ہیں بلکہ اپنے خط کا پھر جواب طلب کرتے ہیں "

اور بالمشافہ گفتگو میں اگر کوئی بات خلاف خاطر ہوتی تو نواب پر غضبناک ہو جاتا تھا۔

یہ تو گورنر جنرل کا سلوک تھا اس سے بڑھ کر ذلت یہ ہوتی تھی کہ انگریزی فوج کے برگڈیر کا ایک ادنیٰ دربان سپاہی نواب کی سواری کے ڈنکے کو یہ کہہ کر روک دیتا تھا کہ اس سے صاحب کے سر میں درد ہوتا ہے اور نواب جب گورنر جنرل سے اس اہانت کی شکایت کرتے تو جواب ملتا کہ خود اپنا مقام بدل دو یا فوج کے رہنے کے لئے کوئی اور مقام تجویز کرو۔

بیلی نے حکم دیا تھا کہ " نواب کے نوبت خانے میں نقارے پر چوٹ نہ پڑے کیوں کہ اس سے ہماری نیند اچٹتی ہے "

یہ اور بحث ہے کہ انگریز نواب سے اس قسم کا سلوک کرنے میں حق بجانب تھے یا نہیں لیکن ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ نواب نے جن پر بھروسا کیا تھا وہ اسے کیا سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ علانیہ کس قسم کا برتاؤ کرتے تھے جب میں نے آب حیات میں یہ جملہ پڑھا کہ :۔

"تہذیب طبعی کی آگ اور شوق انتظام نے نواب کے دماغ کو خشک کر دیا تھا"
تو نواب کے انتظام ملکی کی بھی تفصیل دیکھی "تاریخوں کی چھان بین سے یہ معلوم ہوا کہ :-

(۱) نواب کو گھوڑوں کا بڑا شوق تھا بچھڑوں کو گایوں کا دودھ پلایا جاتا تھا اور گھوڑوں کو دانہ دودھ میں بھگو کر کھلاتے تھے لیکن یہ گھوڑے جنگی ضروریات کے لیے نہیں صرف ہواخوری اور دیکھنے کے کام آتے تھے۔

(۲) شہر میں غلے کی درآمد کا خوب انتظام کیا تھا۔

(۳) سررشتۂ اخبار قائم کیا تھا اس سے جو افراتفری پھیلی تھی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۴) چوری و غارت گری کا بندوبست کیا تھا مگر" اس کے تدارک تامی سے مجبور تھا"

(۵) تیرہ کروڑ روپے جمع کیے۔

(۶) بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں۔

نواب کی سیاسی اور انتظامی زندگی کے مطالعے کے بغیر اس امر کا فیصلہ ممکن نہیں کہ انشا سے کشیدگی کی وجہ سنجیدگی تھی یا قائم قدیم پر ذلتوں اور ناکامیوں کا شدید احساس جس کی وجہ سے انسان چڑچڑا، بدحواس، اور مغلوب الغضب بن جاتا ہے۔

پورا ملک نواب کا دشمن تھا اور یہ بھی ہر شخص کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔

مسند نشینی کے سال ہی نواب سید فیض اللہ خاں بہادر والی ملک رام پور کے بیٹوں کو شبہ مخالفت پر لکھنؤ بلا کر نظر بند کر دیا تھا چوں کہ وہ بے جرم تھے گورنر جنرل نے انھیں رہا کرا دیا۔ علامہ تفضل حسین خاں نواب کے اتالیق تھے اور نواب کی مسند نشینی بھی انھیں کی حسن تدبیر سے ہوئی تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ وہ اپنے اس

احسان اور اتالیقی کی وجہ سے امور سلطنت میں دخیل ہوں گے سب سے پہلے انھیں کے ساتھ ظلم کیا۔ علامہ سے کہا کہ آپ بعہدۂ سفارت کلکتے جلئیے اور خط سند آپکے وہاں پہنچنے سے پہلے رزیڈنٹ کے ذریعے گورنر جنرل کو بھیج دوں گا۔ علامہ کلکتے پہنچے اور بعد قیام چند روز و عدم رسی سند ناکام حالت یاس میں پھرے کہ فی الحقیقت میراحق استادی ادا ہوا۔ از بسکہ صاحب غیرت و صاحب فکر تھے۔ غم و غصے سے تپ محرق ہوئی۔ جب ہزاری باغ پہنچے سنہ ۱۲۱۳ھ مطابق سنہ ۱۷۹۹ء انتقال کیا۔" صد ۱۵۲ سید محمد میر۔

نواب کا انتقال سنہ ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔ سترہ سال کے عرصے میں چار رزیڈنٹ لکھنؤ آئے، لیکن کسی سے نواب کی نہیں بنی اور آخری نو برس میں یعنی سنہ ۱۲۲۰ھ سے کرنل بیلی سے پالا پڑا تھا۔ نواب کا سخت مخالف تھا یہاں تک کہ آخر آخر میں کہیں دوچار ہوجاتے تو ایک دوسرے کو سلام تک کرلینے میں عار تھا اور ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کی امید پر نواب لارڈ مائرا کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ نوابنے بیلی کے ایک سو چودہ سنگین جرم لکھ رکھے تھے اور بیلی نے بھی ان کے ترکی بہ ترکی جواب تیار کئے تھے۔

بیلی کے زمانے میں شہر لکھنؤ میں دو حکومتیں تھیں، ایک کمپنی کی حکومت جس کا نائب بیلی تھا۔ دوسری نواب کی حکومت۔ دونوں کے دربار الگ الگ ہوتے تھے۔ جو امرا نواب سے ناراض ہوجاتے یا جن سے نواب ناراض ہوجاتے وہ بیلی کے دربار سے متعلق ہوجاتے اور نواب سے قطع تعلق کرلیتے تھے، جیسے نواب قاسم علی خاں، تجمل حسین خاں فرزند علامہ تفضل حسین خاں

مرزا جان منشی نواب لماس علی خاں بہادر، نواب سرفراز الدولہ بہادر وغیرہ جن کا وظیفہ یا نوکری نواب موقوف کر دیتے یا چھین لیتے، انھیں کمپنی کی حکومت سے بیلی وظیفہ یا نوکری دلا دیتا تھا۔ نواب سرفراز الدولہ کو جب نواب نے موقوف کر دیا تو نواب لماس علی خاں بہادر انھیں روزانہ ہزار روپیہ خرچ کے لئے دے دیتے تھے۔ امرا یا ان کے متعلقین کو نواب محاسبے میں گرفتار کرنا چاہتے تھے، تو وہ کرنل بیلی کے ہاں پناہ گزین ہو کر کمپنی کی حفاظت میں بخیریت تمام ریاست سے نکل جاتے تھے۔ نواب کی بے بسی بے انتہا تھی ان کے فرماں بردار صرف متوسط اور ادنیٰ درجے کے لوگ تھے۔

نواب نے ایک سررشتہ اخبار قائم کر رکھا تھا جس سے لوگوں کا دم ناک میں آگیا تھا۔ ان مخبروں کی مخبری کرنے کے لئے علاوہ لوگ مقرر تھے۔ غرض لوگوں کی جان عجیب عذاب میں تھی۔ نواب کو غلط اطلاعیں پہنچانے اور سزائیں دلانے کی دھمکیاں دے کر لوگوں سے رشوت لیتے تھے۔ نواب نے جرمانوں کو ایک قسم کی آمدنی خیال کر رکھا تھا۔ اور اپنی زندگی میں مختلف ذریعوں سے تیرہ کروڑ روپے جمع کئے تھے۔

رزیڈنٹ لکھنؤ کرنل سکوٹ ولزلی کو لکھتا ہے:-

"تحصیل مال گزاری میں جو رعایا پر پہلے جور و ستم ہوتے تھے ان میں کچھ کمی نہ ہوئی۔ پہلے یہ روپیہ زمین دار اور نواب کے درمیان کے واسطہ دار غبن کر کے کھا جاتے تھے اور کچھ نواب کے خزانے میں اس کے گل چھرے اڑانے کے لئے داخل کر دیتے تھے۔ اب اس نواب کے عہد

میں یہ فرق ہو گیا کہ سارا ظلم کا روپیہ نواب کے جیب خاص میں داخل ہونے لگا اور کفایت اندیشی اور جز رسی سے خزانۂ خانگی میں تھیلیوں کے ڈھیر لگنے لگا۔ غرض تباہی ملک کی جو اور نوابوں کی مسرفی اور کاہلی اور عیاشی اور اوباشی سے شروع ہوئی وہ اس نواب کی کفایت شعاری اور جز رسی سے اور بر سر ترقی ہوئی ہے۔"

نجم الغنی

"تاریخ اودھ مولفہ سید محمد میر میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۲۱۸ھ میں مرض سرطان سے شفا پانے کے بعد نواب نے منہیات سے اجتناب کیا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو نواب کے عیش و عشرت کی جو مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں وہ اس سے پہلے کی ہیں ان سے نواب کے فطری رجحانات کا پتا چلتا ہے۔

نجم الغنی لکھتے ہیں کہ "کمرے کی ایک جانب رقاصوں اور طائفوں کی ٹولی جمع رہتی تھی۔ ان کے اور نواب کے درمیان ایک دروازہ شیشے کا حائل تھا جس وقت نواب کا دل ملاحظہ کاغذات سے اکتا جاتا تو کرسی سے اٹھ کر شیشوں میں سے نظارہ بازی کرتے اور رقص وغیرہ کا تماشا دیکھتے۔"

ایک دفعہ دیوان راجہ ٹکیت رائے کے یہاں شراب نوشی کی محفل میں اچاگر نامی طائف کو حکم دیا کہ وہ خواجہ حسین چشتی سے بے تکلفی سے پیش آئے اور اس پر مصر ہوا۔ خواجہ نے خنجر نکال لیا اور کہا کہ:-

" اے دختر شجاع الدولہ خموش، اگر پھر ایسا کلمہ زبان سے نکالا تو اسی وقت اپنی اور تیری جان ایک کر دوں گا اور سینے پر چڑھ کر لہو پی جاؤں گا

پھر وہ خود سنبھل گئے اور نواب بچ گئے۔

"فیل نامہ" جس کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ "کوئی بات اس کی قابل اظہار نہیں" نواب ہی کے حکم سے لکھا گیا ہے

حسب الحکم جناب عالی ؎ منظوم ہوئے ہیں یہ آلی

آب حیات میں لکھا ہے کہ "انشا ایک دن نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی، ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا سبحان اللہ بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے اور وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

ان روایتوں کے ہوتے بھی ہمیں اس امر کا تصفیہ کرنا ہے کہ مقطع کون ہے اور مہنسوڑ کون۔

نواب کے بیٹوں میں کوئی جائز وارث نہیں تھا۔ نواب کی وفات کے بعد مسند حکومت کے ایک ایک دعویدار بیٹے کی ولدیت کمپنی کو متعین کرنی پڑی

"نواب کو اس بات کا یقین تھا کہ شہر لکھنؤ کی آبادی طوائفوں کے باعث زیادہ ہے، اس نے حکم دیا تھا کہ کوئی طوائف لکھنؤ سے نہ نکلنے پائے۔"

نواب کے مقطع اور انشا کے مہنسوڑ ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان امور پر غور کرنا چاہیے ان واقعات کے ساتھ نواب کے متعلق ایک اور بات نظر میں ہو تو نتیجہ صاف ہو سکتا ہے وہ یہ کہ نواب کو چوں کہ کسی معتمد اور معزز شخص پر دسترس نہیں تھی۔ اس لئے وہ لوگوں سے ظاہر داری عیاری

اور چالبازی سے پیش آتا تھا۔ کرنل ہیلی کا استاد مرزا جعفر نواب کا سخت دشمن اور بڑا مدبر اور سیاس تھا۔ نواب نے اس کے بیٹوں کی شادی میں دیدہ و دانستہ رعایتیں کیں۔ "اپنے دشمنوں سے مراعات اور ہر کام کو حکمت عملی اور دام عنایت سے سرانجام کرتا تھا۔" خصوصاً لئیم و شنیم امراکو دق اور تنگ کرنے کے لئے سفر و حضر میں حاضر باشی اور سواری اور خواصی کی اجازت دیتا تھا۔ نواب نسرزالدولہ، نواب قاسم علی خاں اور خود سید انشاء اللہ خاں سے اسی قسم کا سلوک ہوا تھا۔

نواب صرف ہندوؤں پر اعتماد کرسکتا تھا۔ کل اہم عہدے ہندوؤں کے سپرد کردیئے تھے، دیوانی، جرنیلی، بخشی گری، سررشتہ اخبار، شہر کی ناظمی دارالضرب کی داروغگی، ان سب عہدوں پر ہندو مامور تھے۔

سنہ ۱۲۲۵ھ میں انشا پر نواب کا عتاب نازل ہوا تھا۔ اور اس وقت تک کرنل ہیلی نے نوابی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اگر کوئی نواب کے سیاسی ماحول پر ایک سرسری نظر بھی ڈال لے تو ان کے سنجیدہ بتین، غیور اور منتظم ہونے کا خیال پیدا ہونا تو درکنار، تعجب اس بات کا ہوگا کہ نواب صاحب مخبوط الحواس کیوں نہیں ہوگئے !

انشا کے نہایت جامع حالات میری تالیف "انشا" میں شایع ہوں گے، انشا کے معاصر تذکرہ نگاروں میں سے "مخزن الغرائب" کے مولف شیخ احمد علی نے انشا کے سب سے زیادہ تفصیلی حالات لکھے ہیں، میں نے یہ عبارت "دستور الفصاحت" سے نقل کی ہے :

سید انشاء الله خان، انشا تخلص، مهین خلف مجز الدوله، سر آمد اطبای زمان، میر ماشاء الله
جعفری النسب نجفی الموطن ست. جدش شاه نور الله نجفی در هندوستان متولد گشته، و میر ماشاء الله بخلاف
پدر بزرگوار سعیها در تلاش غنا نموده. در بنگاله علاجهای نمایان از و بظهور رسیده. و اکثر در میدان
کارزار بیش از دیگران داد شجاعت داده. تمام بدنش جراحت گاه بود. در عالم تنزل، که عهد
نواب قاسم علی خان بود، پیش نواب وزیر الممالک نواب شجاع الدوله مرحوم آمد. آن روزها با وصف
بربادی اسباب، نوزده فیل همراه داشت. سخاوتش بدرجه بود که در جنبش نام حاتم ذکر کردن باعث
خجالت ست. و بذات خود مرغ پلاؤ و نان جو را مساوی می دانست. و همیشه بر زمین خوابیده
و شب زنده دار بود. آخرها چون زمانه را بکام ناکسان دید، کمر را وا کرده، در فرخ آباد منزوی شد.
نواب مظفر جنگ چیزی بقدر ضرورت تواضع می کرد. چند سال است که در همان شهر بجوار رحمت
ایزدی پیوست. و مزارش نیز همان جاست. آمدم بر احوال سید انشاء الله خان موصوف
در صغر سن کتب صرف و نحو و منطق و حکمت تا "صدرا" خوانده چون بشانزده سال رسید،
بحضور نواب وزیر الممالک شجاع الدوله داخل جلسا شد. دران وقت دیوان هندی بطور خود و بطرز
نوی بی استاد در ردیف ارتمام نموده بود، و پاره از اشعار فارسی و عربی هم بر اوراق ثبت داشت.
چون صورت مطبوع و تقریر دلچسپ یافته بود، و در تمام دربار صدای تحسین تکلم او بهمه رسید، مورد عنایات
بندگان عالی و محمود اهل دربار شد. بعد چندے که نواب وزیر موصوف قضا کرد، و در بار آصف الدوله
مجلس را ذلیل شد. خان مزبور چندی به لشکر نواب ذوالفقار الدوله میرزا نجف خان مرحوم و مدتی
در بوندیل کهند، و بعد چند روز باز همپای پدر بدهلی رفته، با محمد بیگ خان همدانی معرکه می بود. و
چند بار خود را بر روی توپ تفنگ تیر و تبر زد. لیکن چون حیات مستعار باقی بود، بسلامت برگشت
و در "سجه نگر" بر سر حرفی با میرزا اسمعیل بیگ خان برادر زاده محمد بیگ همدانی در افتاد، و کار کشیده

بطرزِ نثر دید۔ ہر چہ بزبان آمد بجا و بے جا مضائقہ نکرد۔ جان و حرمت او را چیدش نگہبان شد والا در کشتہ شدن او جائے تامل نبود۔ بالجملہ ازاں طرفہا بار بہ لکھنؤ آمدہ، مدتہا از مخصوصان حضور اقدس مرشدزادۂ آفاق صاحب عالم و عالمیان، میرزا سلیمان شکوہ بہادر بود۔ از بسکہ نازک مزاج است، از انجا ہم دلگیر شدہ برفاقت و رفاقت الماس علی خاں بہادر گرائید۔ بعد چندے در نواب وزیر الممالک ہندوستان یمین الدولہ میرزا سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ دام اقبالہ او را در سلک مقربان خودش سرفراز فرمود۔ ہر روز وقت شریک طعام با آں جناب می باشد۔

بندہ نیازی در خدمتش ارم، او نیز شفقت بحال من از وقت ملاقات تا امروز مبذول دارد۔ در عالم آشنا پرستی بے نظیر زمانہ و در شعر ہندی موجد طرز تازہ و یگانہ است۔ آدمی کہ در صحبت او می رود غم ہائے زمانہ فراموش میکند۔ نقلہائے عجیب و قصہ ہائے غریب یاد دارد، و از پیش طبیعت خود نیز می تراشد۔ لطائف اگر شمار کردہ آید کتابے جداگانہ مرتب می تواں کرد۔ باایں ہمہ شجاعت و جلادت کہ در عرصہ رزم از دستگیر گذشتہ در بزم خود را کمتر از یک طفل نامرد حساب میکند۔ برائے ہر کس نیز سے بر نمی آرد۔ اگر گاہے بخاطرش میگذرد، با آدم ناچیز راہ ہر بیگانہ صورت ظرافت سر می دہد درین صورت اگر ثانی سکوت کرد خیر، و اگر شروع بدشنام نمود می خندد، و او را بغضب می آرد۔ با آدم کم مرتبہ این معاملہ دارد۔ ہفت ہزاری را لمحہ گذارد کہ خلاف طبیعتش حرف زند۔ نواب میرزا قاسم علی خاں پسر نواب سالار جنگ برسر شعرے رو برو جناب عالی ذلیل کرد۔ داستہا در چہار زبان می گوید: فارسی و ترکی و عربی و ہندی۔ عباراتے بے نقطہ در عربی مشتمل بر مطالب مقررے چار چار ورق می نویسد۔ تفسیر چند سورہ ہم بزبان غیر منقوط نوشتہ بود۔ از شعرائے معاصرین با احدے سر فرو نمی آرد، و کسے کہ او را بزعم خود می داند و در تحقیق لفظ و ترکیب عبارات و حسن و قبح کلام خود ازو مضائقہ نمی کند و میان آشنایان خود نیز او را سرآمد آشنایان می شمارد، فخر الشعرا میر محمد حسین قتیل است۔ چند سال پیش ازیں مصحفی ریختہ گو را آں قدر رسوا کوچہ و بازار کرد کہ اگر غیرت می داشت خود را میکشت۔ ہمیں بر تختہ سوار کردن باقی ماندہ بود۔ دگر ہیچ ذلتے نبود کہ بآں بیچارہ نرسید۔ شرحش طول دارد، و احوالش عجیب است۔ خدایش سلامت دارد!"

قواعد اردو و رسم خط

اردو زبان کے قواعد کا رسم خط سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ کسی کی تحریر دیکھ کر اس کی قواعد دانی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اردو کی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں ایسی کتابیں شاذ و نادر ہیں جن میں رسم خط کی پابندی قواعد کے تحت میں پوری طرح ہوئی ہے، اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ مصنفوں نے رسم خط کو قواعد سے مطابق کرنے کی پروا نہیں کی، اور دوسری وجہ "نزلہ بعضو ضعیف می ریزد" کے قسم کی ہے، یعنے رسم خط کی تمام غلطیوں کو بے چارے کاتبوں کے سر تھوپ دیجئے، کاتب تو بدنام ہونے سے رہے کیونکہ یہ طبقہ نیک نام کب تھا، کم از کم مصنفین اور مولفین پر بے اعتمادی بیس فیصدی معقولیت نہ رہے گی، اور تو اور خود قواعد اردو کی کتابوں میں کاتبوں نے صاحب تصنیف تالیف کی کافی نگرانی نہ ہونے کے سبب رسم خط کی اتنی غلطیاں کی ہیں کہ اکثر شبہ ہو جاتا ہے کہ کتاب اسی زبان میں لکھی گئی ہے جس کے قواعد بیان ہوئے ہیں یا کوئی اور، اردو کو تفریح طبع کے مشغلے سے نکل کر علوم وفنون کی زبان بنے ہوئے مدت ہوئی اور جامعہ عثمانیہ نے شہر علم دکن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے اس زبان میں کتابیں بہم پہنچانے کا شاہانہ انتظام کیا

لیکن رسم خط کے قواعد کو صرف ایک ہفتے کی غور و مشق سے ہر کاتب جس پر اس نام کا اطلاق ہو سکتا ہے آسانی سے ذہن نشین کر سکتا ہے نہ خود انہوں نے ذہن نشین کیا اور نہ مصنفین و مولفین نے کبھی ان قواعد کو کاتبوں کے ذہن نشین کرانے کی ضرورت سمجھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسم خط کا قواعد سے کوئی تعلق باقی نہ رہا اور دنیا سے اردو میں بھانت بھانت کے رسم خط جاری ہو گئے۔ اس نقص کو رفع کرنے اور ملک بھر میں رسم خط کو یکساں بنانے کی طرف سب سے پہلے مشہور مطبعوں کو توجہ ہونی چاہئے۔ اگر محرر اپنی تحریروں میں رسم خط کی پابندی کریں تو کاتبوں کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اسے مسخ کر دیں۔ اردو میں رسم خط کی پابندی اس لئے ہو سکتی ہے کہ کاتب اس کی جان کے دشمن نہیں اور ان سے صحیح یا ان کی اصلاح ممکن ہے۔ رسم خط کی غلطیوں کو کاتبوں سے منسوب کر دینے کا رواج اسی قدر کہنہ و فرسودہ ہے جس قدر کہ کام لوگوں کا اپنے اعمال کے نتائج کو مشیت ایزدی کے حوالے کر دینے کا۔

چودھری نظیر الحسن صاحب فوق المیزان کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ کتاب کا صحیح چھپانا اور صحت میں کوشش کرنا کسی مصنف کے واسطے ایک جان کا صدمہ ہے اور میرے خیال میں کوئی شخص پورے طور پر اس کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ مولوی شبلی صاحب نے شعر العجم میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "دنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہے اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا" بھی اضافہ کرنا چاہئے، یہ مصیبت مدت سے مجھ کو پیش آئی ہے، لیکن اصلاح کی کوئی صورت نہیں نکلتی، کاتبوں اور پریس

کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حروف کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں "

چودھری صاحب اور علامہ شبلی کے تجربے حقایق ہیں، کوئی انسانی کام نقائص سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا تاہم تصحیح میں امکان بھر کوشش ضرور چاہیئے۔ پتھر کے چھاپے میں اگر چھپنے میں حروف کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں، تو ہو جائیں، یہ کوئی انوکھی بات نہیں، لیکن ٹائپ کے حروف میں جو کتابیں چھپتی ہیں، ان میں بھی قواعد کے تحت رسم خط کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ اس مضمون کا مقصد صرف قواعد کے تحت رسم خط کو متعین کرنا ہے اور جو امور اس سے متعلق نہیں، ان کا اس مضمون سے تعلق نہیں، اگر اردو کے جدت پسند سرپرست مجموعی حیثیت سے اردو کے موجودہ نستعلیق رسم خط سے مطمئن نہیں ہیں اور اس کو کسی بہتر، خوش نما تر اور آسان تر رسم خط سے بدل دینا چاہتے ہیں تو ع

مبارک باشد و باشد مبارک

مگر نیا گھر بنانے کی فکر میں رہائش کے مکان کو بے مرمت چھوڑ دینا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ کل چھت کا ایک حصہ بیٹھ گیا تھا اور آج ایک دیوار گر پڑتی ہے اور نہیں معلوم کہ کل اپنے ساتھ کیا تباہی لائے گا، ہمیں ضرور خانہ بدوش بنا دے گا۔

رسم خط میں عام طور پر جو غلطیاں واقع ہو رہی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

اردو اور فارسی زبان میں ان الفاظ کے سوا جن کے آخر ہائے مختفی ہوتی ہے (ہائے مختفی کو ہائے بیان فتحہ یا کسرہ بھی کہتے ہیں) کسی لفظ کا آخری حرف متحرک نہیں ہوتا، مثلاً :- جامہ اور نامہ (جامَ اور نامَ) میں

ہائے بیان فتحہ اور چہ اور کہ (چ اور کِ)، میں ہائے بیان کسرہ ہے یعنے جامہ اور نامہ چہ اور کہ کے آخر میں جو ہائیں ہیں، وہ خود ظاہر ہونے کے لئے نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لئے آتی ہیں کہ ان کے ماقبل حروف پر فتحے اور کسرے ہیں، اردو میں بھی اسی کا تتبع ہوا، مثلاً تیرہ سے اٹھارہ تک کے اعداد کے آخر کی "ہ" ہائے بیان فتحہ ہے، اس میں ایک نکتہ یہ ہے کہ کسی لفظ کے آخری حرف کا متحرک ہونا چوں کہ فارسی زبان کی ساخت اور مزاج کے ناموافق تھا، اور اس کے باوجود ایسے لفظ موجود تھے جن کے آخری حرف متحرک تھے تو فارسیوں نے ایک ہا کا اضافہ کر دیا اور اس ہا کے ایسے نام رکھے جن سے اس کا محض بھرتی کے لئے ہونا ثابت ہو جائے، اگر سیاق وسباق سے لباس اور خط کے معنے واضح ہو جائیں اور پیالے اور اہتم کے معنوں کا دھوکا نہ ہوتا ہو تو جامہ ہا اور نامہ ہا کی جگہ جامہا اور نامہا لکھنا فارسی رسم خط میں جائز ہے، اور چہ کی جمع چہا اسی اصول پر ہے یعنے پڑھنے والے کے لئے اگر قرینہ مہیا کر دیا گیا ہے کہ وہ جامہا کو میم کے زبر سے پڑھے نہ کہ میم کے سکون سے تو ہائے مختفی کا حذف جائز ہے، یہ قاعدہ کچھ مذکورہ ہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عام ہے، اسی ضمن میں اس امر پر بھی نظر ہونی چاہیئے کہ فارسی میں ہائے زائد اور نون نفی کو جب لفظ سے منفصل لکھتے ہیں تو ان کے ساتھ یہی ہا بڑھا دیتے ہیں، مثلاً بیبیں کی جگہ بہ بیں نہیں بلکہ بہ بیں اور نکرد کی جگہ نہ کرد نہیں بلکہ نہ کرد لکھیں گے۔ اگر یہی کا میم علاحدہ لکھنے کا دستور ہوتا تو مکن کی جگہ مہ کن لکھنا قواعد کی رو سے درست ہوتا اور ہونا بھی چاہیئے لیکن اس کا رواج نہیں

ایسے ہی مواقع پر پہلو بچانے کے لئے قواعد نویس "سماعی اور قیاسی" کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، اردو میں بھی جب ہَر کا مخفف ہِ ہوا تو اس کے آخر سے بڑھ گئی ہِ ہ، حاصل یہ کہ حقیقی طور پہ نہیں تو اعتباری طور پر ہی سہی فارسی اور اردو میں الفاظ کے آخری حرف کو ساکن مانا جائے گا، اس لئے فارسی رسم خط میں اور اس کے تتبع میں اردو رسم خط میں بھی عربی الفاظ کے آخر ہمزہ نہیں لکھتے، مثلاً، علماءُ، صحراءُ، اداءٌ، وفاءٌ کے آخری ہمزے اور تنوینیں فارسی رسم خط میں حذف ہو کر صرف علما، صحرا، ادا وفا، رہ جاتے ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ الف متحرک کا نام ہمزہ اور ہمزۂ ساکن کا نام الف ہے یعنی اصل میں ہمزہ ہے اور سا ہیں الف اور مجازاً ہمزہ کو بھی الف کہنے لگے، ہمزہ اور الف کا فرق بتانے کے لئے حروف تہجی میں لا (لام الف ہمزہ) کا اضافہ ہوا۔ غرض فارسی میں آکر علماءُ اور صحراءُ کا متحرک حرف ہمزہ آخر میں برقرار نہیں رہ سکتا اور اداءٌ اور وفاءٌ کی تنوینیں اس لئے باقی نہیں رہیں کہ عربی لفظ کے سوا کسی دوسری زبان کا لفظ منون ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

م، ضیاء الدین معلم کلیہ وشوا بھارتی، شانتی نکیتان، بنگال نے مرزا خاں ابن فخر الدین محمد کی تصنیف قواعد کلیہ بھاکا کو اپنی تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ کتاب سیتو یونیورسٹی کے کتب خانے میں ملتی ہے، اب تک ہم نے الف کی دو قسمیں ممدود و مقصور سنتے آئے ہیں لیکن مرزا خاں نے

ہر حرف کی ممدود و مقصور دو قسمیں قرار دی ہیں۔ اور یہ عبارت نہایت معقول اور نہایت مفید ہے، لغت نویسوں نے جس حرف پر کوئی اعراب نہیں ہوتا، اس کو مفتوح تسلیم کیا ہے اور فتح الف کا بھائی ہے جب کھینچ کر پڑھا جاتا ہے تو ممدود ہے ورنہ مقصور، مذکورہ رسالے میں آکاس بانی کا تلفظ یوں لکھا ہے، "بالف و کاف تازی خفیفہ ممدود و سین مہملہ موقوف وبائے موحدہ خفیفہ ممدودہ و نون مکسورہ ویائے معروف" اس لحاظ سے جامہ میں میم مقصور اور علما میں میم ممدود ہے، کہ، اور یہ مصنف کی اصطلاح ہیں، کاف تازی ثقیلہ اور بائے موحدہ ثقیلہ ہیں۔

اب بحث یہ ہے کہ جن فارسی و عربی الفاظ کے آخر میں الف ہوتا ہے ان میں مرکب اضافی کی حالت میں جبکہ ترکیب فارسی ہے کیا تغیر ہوتا ہے، پہلے مرزا غالب کا فیصلہ سنئے:-

اقسام یائے تحتانی۔ یاد رکھو تحتانی تین طرح پر ہے۔

(۱) جزو کلمہ ع ہمائے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد۔ ع

اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشائے را۔ یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے جزو کلمہ ہے، اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

(۲) تحتانی مضاف ہے، صرف اضافت کا کسرہ ہے، ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم، توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا، ندائے تو شوم، رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

ہے دو طرح پر ہے یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی، دوسری توصیفی
و تنکیری وہ مجہول ہوگی، مثلاً مصدری "آشنائی یہاں ہمزہ ضرور بلکہ نہ لکھنا عقل کا قصور
توصیفی، آشنائے یعنے ایک شنا یا کوئی آشنا، یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے
دانا نہ کہلاؤ گے۔ (خط نمبر ۶۲ ادبی خطوط غالب)

غالب کہتے ہیں کہ آسیا اور آشنا، فدا اور رہنما یعنے وہ لفظ جن
کے آخر میں الف ہے، جب کسی لفظ کی طرف مضاف ہوتے ہیں تو اضافت
کے لئے الف کو کسرہ دینا محال تھا کیوں کہ یہ الف مبنی ہوتا ہے اور اس پر کوئی
حرکت نہیں آسکتی اس لئے الف کے بعد ایک یائے مجہول کا اضافہ کر کے اس کو
مکسور کیا، اس کو یائے وقایہ کہتے ہیں، مثلاً لفظ خدا کے آخر میں الف
ندا بڑھانے کی ضرورت ہوی تو یہی یائے وقایہ بڑھا کر خدا یا بنایا اور اردو
میں مادۂ فعل پا اور پکوا کے آخر میں ماضی مطلق بنانے کے لئے الف بڑھانے
کی ضرورت ہوئی تو بھی یہی یائے وقایہ بڑھا کر پایا اور پکوایا بنایا۔

ایک نکتہ، گربہ میں ہائے مقصور ہے اور دیبا میں یائے
ممدود، یعنے ایک کے آخر میں زبر ہے اور دوسرے کے آخر میں الف اور
زبر جب کھینچ کر پڑھا جاتا ہے تو الف بن جاتا ہے، یعنے مرزا خاں کی اصطلاح
میں جس کو ہم الف کہتے ہیں وہ زبر ممدود ہے اور جو زبر ہے وہ الف مقصور
جب ثابت ہوگیا کہ گربہ کے آخر میں الف مقصور ہے تو یہاں بھی اضافت کے
لئے یائے وقایہ بڑھانا پڑا اور نحویوں نے یہی کیا یعنے ایک یائے مجہول دی (
اس پر لکھ دی اور اسے ہم نے کم نظری سے ہمزہ سمجھ لیا۔ اب "علمائے دین"

کی یائے وقایہ پر ایک ہمزہ بزعم خود بڑھانا گویا ایک اور یائے وقایہ بڑھانا اور بقول غالب گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

عربی کے وہ کل لفظ جن کے آخر کی تے ساکن ہو کر ہائے مختفی بن جاتی ہے اسی حکم میں داخل ہیں۔ مثلاً عاقلہ، مباحثہ، وغیرہ۔ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہوا کہ علما، صحرا، ادا، اور وفا کے آخر میں حرف معنوی 'یائے معروف' کا اضافہ کرنا ہو تو ہمزہ وقایہ بڑھاتے ہیں، جیسے علمائی صحرائی، ادائی، وفائی، ادائی کی جگہ ادائگی فی زمانا غیر محقق لوگ لکھتے اور بولتے ہیں۔ جب الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے تو وہ یائے معروف کے لاحق ہونے پر گ سے بدل جاتی ہے، جیسے قلعہ سے قلعگی اور نظارہ سے نظارگی، جامہ سے جامگی اور خامہ سے خامگی ادا سے ادائی کی جگہ ادائگی کہنا درست نہیں۔

اردو کے بعض ادیبوں نے اگر ادائگی کا لفظ استعمال کیا بھی ہے تو یہ اس کے صحت کی دلیل نہیں۔ شرر نے تر سٹھ برس بعد (۱۸۴۲ - ۱۹۰۵) نسیم کی زبان پر اعتراض کیے، چکبست نے محنت شاقہ سے ان کے صحیح ہونے کی سند میں نسیم سے پہلے کے اور نسیم کے معاصر شعرا کے کلام سے مثالیں تلاش کر کے پیش کر دیں۔ اہل نظر نے دونوں کی دیدہ ریزی کو فضول سمجھا۔ شرر کی محنت اس لئے ضائع گئی کہ ان کی نظر ارتقائے زبان پر نہیں تھی اور چکبست کی تلاش اس لئے، تحقیق حاصل ثابت ہوئی کہ "سب اعتراضات کا بجا ہونا جس طرح دشوار ہے اسی طرح

ہر ایک جواب کا باصواب ہونا بھی مشکل ہے"۔ مگر زبان کی تحصیل کرنے والوں کے لیے دونوں کی کوششیں ان مول ہیں؛ ان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کوئی زبان اپنے زمانے کے لحاظ سے فصیح و بلیغ اور آئندہ زمانے کے لحاظ سے غلط و رغلط ہوسکتی ہے۔ اس لئے جس زمانے میں جس قاعدے کو صحیح یا غلط کہا جاتا ہے، اس کی صحت یا غلطی اس زمانے کے مسلم قواعد پر مبنی ہوتی ہے۔ آئندہ سے اس کا کوئی مستقل تعلق نہیں ہوتا۔

اب یہ معلوم کرنا ضروری ہوا کہ وہ کونسی تیئیں ہیں جو ساکن ہوکر "ہے" بن جاتی ہیں، عربی کے الفاظ کے آخر میں آنے والی سب تیئیں ساکن ہوکر "ہے" نہیں بن جاتیں بلکہ صرف وہی تائیں "ہے" بن جاتی ہیں جن کو مختصر اور گول لکھتے ہیں اور ان مختصر اور گول لکھی جانے والی تاؤں کے بارے میں مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کا قول پڑھئے:۔

مواعظ حسنہ خط نمبر ۲۵

" بشیر لاؤ اس مختصر اور گول ۃ کے قاعدے کو زیادہ صاف کر ڈالیں، واضح ہو کہ سوائے الفاظ عربی کے گول ۃ لکھنی روا نہیں کیونکہ یہ رسم الخط عربی کی ہے اور سب عجمی الفاظ میں ہمیشہ لمبی "ت" لکھنی ہوگی، جیسے، بت، دست، آتش پرست، مست، ہمالیہ پربت، سورت، مورت۔ عربی میں صرف چار قسم کی "ت" لمبی لکھی جاتی ہے (۱) وہ "ت" جو ماضی کے صیغوں میں علامت فعل یا ضمیر یا مفعول یا اسم فاعل

کی ہو جیسے ۔ ضربۃ ۔ ضربۃٍ ۔ ضربۃٌ ۔ ضربۃً ۔

(۲) تاے جمع مونث سالم جیسے مسلمات، صالحات، واہبات، بنات،

(۳) تاے اصلی جیسے، وقت ۔ سبت ۔ التفات، قوت، موت ۔

(۴) جب لام کلمہ حذف ہوکر ثنائی رہ گیا تو اس کے آخر میں جو تاے تانیث لاحق ہوگی طولانی لکھی ہوگی جیسے بنت ۔ اخت، اصلی مادہ بنو، اخو، ہے ۔ ان چار قسموں کے علاوہ جتنی تیئیں ہیں، سب کو مختصر یا گول لکھنا ہوگا ۔ ہذا فاحفظہٗ ۔

طبقات الشعراء کے آخر کا ہمزہ درست ہے کیوں کہ ترکیب عربی ہے ۔ طبقۂ شرفا جس کی ترکیب فارسی ہے، میسور کی طرف مضاف کریں تو یاے وقایہ لانا پڑے گا، جیسے طبقۂ شرفاے میسور اور اگر طبقات الشعراء کو میسور کی طرف مضاف کریں تو ہمزے کو صرف کسرہ دے دینا کافی ہے ۔ جیسے طبقات الشعراءِ میسور، اسی طرح افضل علماے میسور اور افضل العلماءِ میسور کی اضافی ترکیبیں قیاساً درست ہیں ۔ سراپاے سخن میں خواہ یا کو جزو کلمہ تسلیم کریں خواہ وقایہ دونوں صورتوں میں ہمزہ غلط ہے ۔ سراپاے سخن بلا ہمزہ چاہیے ۔

حرف ربط انھیں مذکر الفاظ پر اثر کرتے ہیں، جن کا آخری حرف جمع میں کسی دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے، اس قسم کے الفاظ کو اختصار کے لئے منصرف کہا جائے گا! اور وہ حرف جو جمع میں بدل جاتے ہیں ۔ آ اور ہٖ ہیں اور جس حرف سے بدل جاتے ہیں، وہ "ے" ہے ۔

جیسے انڈا سے انڈے اور پنجہ سے پنجے۔ رو ا (ں) سے روے (ں) ساتواں سے ساتوے (ں)، اور بلا استثنیٰ کل واحد مذکر منصرف الفاظ کی صورت حرف ربط کے آنے سے جمع کی سی ہو جاتی ہے۔ جیسے انڈے کو، بندے کو، روے (ں) کو، ساتوے (ں) کو، یا یوں کہئے کہ حرف انھیں مذکر الفاظ کا آخری آ یا ہ حرف ربط کے آنے سے یا سے بدل جاتا ہے، جن کی جمع انھیں حروف کو یا سے بدل کر بنائی جاتی ہے، جیسے ایک انڈا اور دس انڈے یعنے اگر کسی مذکر لفظ کی جمع اس طرح نہیں بنتی تو اس پر حرف ربط بھی اثر نہیں کرتا۔ دریا، داتا، خدا، ہما، عصا، وغیرہ الفاظ غیر منصرف ہیں اور غیر منصرف وہ واحد مذکر الفاظ ہیں جن کی صورت واحد اور جمع میں یکساں رہتی ہے، جیسے ایک دریا اور دس دریا اور واحد پر حرف ربط کے آنے سے کوئی تغیر نہیں ہوتا، جیسے دریا کو، خدا نے وغیرہ

مونث لفظ منصرف ہیں نہ غیر منصرف یعنے نہ کبھی واحد الفاظ کا آخری حرف جمع میں کسی حرف سے بدلتا ہے اور نہ یہ کبھی واحد اور جمع میں مشترک ہوتے ہیں، اس لئے کلیہ قاعدے کے مطابق ان پر حرف ربط اثر نہیں کرتا۔

حرف ربط کے اثر کرنے نہ کرنے کا سوال صرف مذکر الفاظ ہی سے متعلق ہے، یعنے جب "لڑکے نے" لکھ سکتے ہیں، تو "خدے نے" کیوں نہیں؛ مونث الفاظ کے بارے میں سرے

سے یہ بحث بیکار ہے، کیوں کہ کلیتہً کوئی مونث لفظ جس کے آخر میں آ یا ہ ہو، حرف ربط کے آنے سے نہیں بدلتا، جیسے فاتحہ، سجدہ، مالا اور املا جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے، جب مونث استعمال ہوں گے تو حرف ربط کے آنے سے فاختہ، معشوقہ، پوجا اور انشا کی طرح ان کے آخر کا الف یا ہے یائے مجہول سے نہیں بدلے گا۔ اردو کے ان دو جملوں میں (۱) خلیفہ نے حکم دیا (۲) خلیفے نے حکم دیا، پہلے جملے سے خلیفہ کا عورت ہونا اور دوسرے سے خلیفے کا مرد ہونا ظاہر ہوتا ہے جیسے ان دو جملوں سے (۱) وہ فاتحہ (بہ ہائے مختفی) میں شریک تھا اور (۲) وہ فاتحے میں شریک تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جملے میں فاتحہ مونث استعمال ہوا ہے اور دوسرے میں مذکر، مولوی نذیر احمد دہلوی مراۃ العروس میں لکھتے ہیں کہ "مکتب کی خلیفائیں بچوں کو لادے لادے پھرا کرتی تھیں" اگر خلیفے کے آخر کی ہائے مختفی یائے مجہول سے نہ بدلے تو یہ لازماً واحد اور جمع میں مشترک ہوگا خلیفہ کہتا ہے (واحد) اور خلیفہ کہتے ہیں (جمع) اور یہ کلیہ ہے کہ کوئی مذکر لفظ جس کے آخر میں ہائے مختفی ہے واحد اور جمع میں مشترک نہیں ہوتا، اس لئے خلیفے پر حرف ربط ضرور اثر کرے گا۔

اس لئے زید کے مقابلے میں کی جگہ زید کے مقابلہ میں لکھنا سراسر غلط ہے، رسم خط ایسا ہونا چاہئے کہ کوئی مبتدی اس کی مدد سے ہائے مختفی میں آخر ہونے والے الفاظ کی تذکیر و تانیث معین کرنا چاہے تو کر سکے،

خلاصہ تعدیہ فعل صفحہ ۱۸۱ دریائے لطافت فارسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی

(۱) بہ زیادت ا ماقبل علامت مصدری مانند اٹھنا و اٹھانا۔

(۲) بہ زیادت لا ماقبل علامت مصدری مانند کہنا و کہلانا نہ کہانا کہ زبان اہل مغلپورہ باشد۔

(۳) بہ زیادت لا درمصادرے کہ بعد حذف علامت مصدر یا (یائے معروف یا مجہول) باقی ماند یارا حذف نمودہ لتعدیۂ آں بہ لا درست باید کرد مانند پینا، و پلانا، جینا و جلانا، دینا و دلانا۔

نوٹ :- لینا سے لانا مستثنیٰ ہے اس میں تعدیہ الف کے ذریعے ہوا ہے۔

(۴) بہ زیادت ا یا لا ماقبل علامت مصدری بعد حذف حرف دوم کہ یائے مجہول باشد مانند، دیکھنا، دکھانا، دکھلانا، و بیٹھنا بٹھانا، بٹھلانا، و نہ بیٹھانا کہ لغت ہندواں و سکنۂ مغل پورہ است۔

نوٹ :- یا خواہ وہ معروف ہو یا مجہول یا یائے ماقبل مفتوح ہر حالت میں حذف ہو جاتی ہے اور حرف دوم کی قید اور یائے مجہول ہونے کی شرط دونوں بے کار ہیں۔

(۵) بہ زیادت لا یا لوا ماقبل علامت مصدری و یا موافق قاعدۂ گزشتہ حذف می شود مانند دینا، دلانا، دلوانا، و سینا، سلانا، سلوانا۔

(۶) بہ زیادت وا ماقبل علامت مصدری مانند کھلنا، کھلوانا۔

(۷) بزیادت وا ماقبل علامت مصدری در جمیع مصادر کہ آ و وٓ و یٓ، حرف دوم آں باشد حرف مذکور در حالت تعدیہ محذوف گردد۔

مانند ا و ی

پالنا، پلوانا پھونکنا پھنکوانا پھینکنا پھنکوانا

ناچنا نچوانا . . . .

گانا، گوانا . . . .

ماننا منوانا . . . .

جھانکنا جھنکوانا . . . .

ٹانکنا ٹنکوانا . . . .

(۸) تعدیہ فعل خلاف قیاس از اکھڑنا، اکھاڑنا، و اکھیڑنا می آید و موافق قیاس اکھڑانا باشد

نوٹ[۱]:۔ انشا نے تعدیہ بذریعہ اشباع کا ذکر نہیں کیا، مانند ملنا پالنا، رکنا، روکنا، پھرنا، پھیرنا، اور حروف تعدیہ میں ا، کا دو بار، لا، کا چار بار اور وآ کا دو بار ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن میں ان کے الحاق کے متعلق کوئی واضح اور معین قواعد نہیں تھے،

نوٹ[۱]: مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی فرماتے ہیں "فائدہ" پرانی اصطلاح بہت اچھی ہے اور "nota bene" کے مفہوم کو پوری طرح ادا کرتی ہے، اسی کو کیوں نہ رکھئے، میں نے نوٹ کا لفظ صرف اس لئے بحال رکھا ہے کہ اس کی غلطی واضح ہو۔

تعدیہ افعال کے قواعد

صہبائی نے "رسالۂ صرف و نحو اردو" میں پہلے باب کی چوتھی فصل میں لکھا ہے کہ مادۂ فعل میں "حروف تعدیہ کے داخل ہونے کے بعد کچھ تغیر واقع ہوتی ہے۔ اس کا ضبط قاعدے سے مشکل ہے وہ فقط سماعت پر موقوف ہے" لیکن صاحب مصباح القواعد نے صاف لکھ دیا ہے کہ "مصدر لازم سے متعدی بنانے کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں"۔ میں نے استقرائی طور پر جو کلیے اور نتائج اخذ کئے ہیں، وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ اردو کی کائنات میں صرف اتنے ہی مصدر ہیں، جتنے کہ نقشے میں درج ہیں، یعنے سوا دو سو اور عربی کی اصطلاحیں صرف سہولت کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ ان کی پیروی مقصود نہیں۔

مادۂ فعل میں یا تو حروف علت میں سے کوئی ایک حرف ہوگا۔ یا نہیں ہوگا، پہلی قسم کو معتل اور دوسری کو صحیح کہہ سکتے ہیں۔ مادۂ فعل میں پہلا حرف تو حرف علت ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے حرف علت یا درمیان میں آئے گا (معتل العین)، یا آخر میں (معتل اللام)، جیسے نہانا، سونا، جینا، (معتل اللام لازم) جاگنا، گھومنا، بھیگنا، (معتل العین لازم) کھانا، دھونا، سینا، (معتل اللام متعدی) لادنا، تولنا، سیکھنا، (معتل العین متعدی) یہ مادے یا لازم ہوں گے یا متعدی بنفسہ جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے۔

صحیح مادے بھی لازم اور متعدی دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔

جیسے اترنا، رکنا، پھرنا (لازم) بدلنا، چننا، ملنا، (متعدی)

متعدی کی دو قسمیں ہیں۔ "ایک یہ کہ اصل میں اسی معنی کے واسطے موضوع ہو، دوسری یہ کہ حروف تعدیہ کے اس پر داخل کرکے بنالیا ہو" صہبائی پہلی قسم کو متعدی بنفسہ اور دوسری کو متعدی بالواسطہ کہتے ہیں۔

اپنی تالیف A grammar of the Hindustani and Urdu language میں J. T. platts لکھتے ہیں ص۱۶۱

A causal verb is termed by the native grammarians فعل متعدی بالواسطہ a verb which passes on (to an Object) by means of (an increment) in contradistinction to a verb which is transitive per se' or فعل متعدی بنفسہ

متعدی کی دوسری قسم میں واسطہ حروف تعدیہ کا ہے نہ کہ کسی شخص کا" قواعد اردو میں لکھا ہے "ایک قسم متعدی بالواسطہ کی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ فعل کے وقوع کے لئے کسی دوسرے واسطے کی ضرورت ہے، جیسے کھانا متعدی، کھلانا متعدی المتعدی، کھلوانا متعدی بالواسطہ" (افعال کا تعدیہ ص۳۱) یہ درست نہیں، کھلانا اور کھلوانا دونوں متعدی بالواسطہ ہیں، پہلا متعدی بدو مفعول ہے اور دوسرا متعدی بہ سہ مفعول۔

تعدیہ افعال کی بنیاد تین امور پر ہے۔

(۱) جس مادے کا تعدیہ منظور ہے اس میں سے حرف علت کا حذف یعنی تخفیف جیسے سوکھ سے سُکھ (مثل)

(۲) حرفِ تعدیہ کا اضافہ، جیسے سُکھ سے سُکھا (معتل)، جل سے جلا (صحیح لازم)، لکھ سے لکھا (صحیح متعدی)

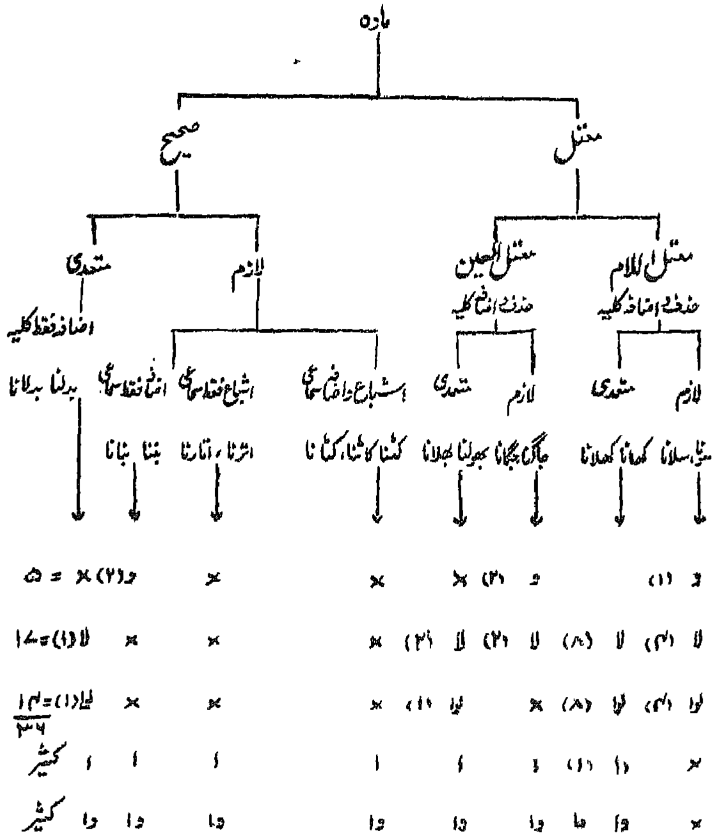
(۳) اشباع، جیسے ٹل سے ٹال اور اتر سے اتار (صحیح لازم)

نوٹ:۔ دو حرفی مادے میں اشباع لفظ کی پہلی حرکت میں اور سہ حرفی مادے میں لفظ کی دوسری حرکت میں ہوتا ہے، ان میں سے تخفیف، معتل کے ساتھ خاص ہے اور اشباع صرف صحیح لازم میں ہوتا ہے، صحیح متعدی میں کبھی اشباع نہیں ہوتا، اور اضافہ معتل اور صحیح لازم اور صحیح متعدی تینوں میں ہوتا ہے۔ معتل کا تعدیہ تخفیف کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جیسے کھانا سے کھلانا، دیکھنا سے دکھانا، اردو زبان کے غالباً صرف چار مصدر ایسے ہیں جن میں حرف علت تعدیے میں بحال رہتا ہے۔ جیسے بیٹھنا سے بیٹھانا ٹھہرنا سے ٹھیرانا، چھوٹنا سے چھوڑنا، ٹوٹنا سے توڑنا، ان میں سے پہلا فصحا کی زبان پر نہیں۔ دوسرے کا بدل ٹھہرانا موجود ہے گویا صرف دو مصدر اس کلیے سے مستثنیٰ رہ گئے۔ تعدیے کے متعلق صہبائی کا یہ قول اہم ہے کہ "حروف تعدیہ بعض جا سے ہیں وا کہ اس سے پہلے لام ہو اور کہیں فقط وا اور کہیں لا اور بعض کلمہ ان سب حالتوں پر آتا ہے مگر فصحا ان تین میں سے بعض حالت اختیار کرتے ہیں"

بعض صحیح لازم مادوں کا تعدیہ کبھی اشباع اور اضافہ دونوں طرح ہوتا ہے جیسے پھنسنا سے پھانسنا (اشباع) اور پھنسانا (اضافہ) اور ان کے معنوں میں بھی فرق ضرور ہوتا ہے، کبھی تعدیہ صرف اشباع سے ہوتا ہے، جیسے

جگڑنا سے بگاڑنا اور کبھی صرف اضافے سے جیسے ڈرنا سے ڈرانا، زبان کے تتبع سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیح لازم مادوں میں تعدیہ بذریعۂ اشباع اور تعدیہ بذریعۂ اضافہ کی تعداد مساوی ہوتی ہے لیکن صحیح لازم مادے میں اشباع کہاں ہونا چاہئے اور اضافہ کہاں اس کا کوئی قاعدہ نہیں بن سکتا" وہ صرف سماعت پر موقوف ہے"

تعدیۂ افعال کا نقشہ



جملہ سوا دو سو مصادر میں سے صرف چھتیس مصادر کا تعدیہ و، لا، لوا سے ہوتا ہے اور باقی کے مصادر میں متعدی بہ دو مفعول بنانے کے لئے الف اور متعدی بہ سہ مفعول کے لئے وا بڑھاتے ہیں اور انہیں کا بیان اہم تھا، قواعد نویسوں نے ان دو کو خواہ مخواہ و، لا، اور لوا کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا ہے۔

تعدیۂ افعال کے لئے یہ حرف استعمال ہوتے ہیں، و، لا، لوا، وا، ا اور یہ سب مادۂ فعل کے بعد بڑھائے جاتے ہیں، اشباع کے سوا تعدیے کے کسی اور قاعدے میں مادۂ فعل کے درمیان میں حرف علت نہیں آتا۔

و (۱) واو کے ذریعے تعدیۂ معتل صرف تین مصادر میں ہوتا ہے جیسے سمانا سے سمونا، ڈوبنا سے ڈبونا، بھیگنا سے بھگونا۔

(۲) واو کے ذریعے تعدیۂ صحیح صرف دو مصدروں میں ہوتا ہے جیسے گڑنا سے گڑوانا، چبھنا سے چبھونا۔

معتل اور صحیح دونوں میں واو کا تعلق صرف مصادر لازم سے ہے قواعد نویسوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ پلاٹس لکھتا ہے:-

But in a few verbs the vowels a, u, would appear to have coalesced into o: e.g. bhigona, dubona, garona, etc, the causals of bhigna, dubna and garna

پلاٹس کا یہ کہنا کہ آ اور اُ کی آوازیں گویا اُو سے مربوط ہو گئی ہیں، صحیح نہیں اس نے ان مثالوں کا تجزیہ نہیں کیا۔

مصدر لازم		تخفیف	+	اضافہ	=	تعدیہ
بھیگنا	سے	بھگ	+	و	=	بھگونا
ڈوبنا	سے	ڈب	+	و	=	ڈبونا
گاڑنا	سے	گڑ	+	و	=	گڑونا

لا (۱) لا کے ذریعے تعدیہ صرف معتل میں ہوتا ہے اور وہ بھی معتل اللام سے خاص ہے۔

" در مصادرے کہ بعد حذف علامت مصدر یا (یائے معروف یا مجہول) باقی ماند یا را حذف نمودہ تعدیہ آں بہ لا درست باید کرد مانند پینا و پلانا و سینا و سلانا و جینا و جلانا و دینا و دلانا۔"

لینا سے لانا مستثنیٰ ہے اس میں تعدیہ الف کے ذریعے ہوا ہے[1]

اگر الف باقی رہے تو تین مصدر نہانا، تپانا اور کھانا کا تعدیہ لا سے ہوتا ہے۔

اگر واؤ باقی رہے تو پانچ مصدر رونا، سونا، چھونا، دھونا، ڈھونا کا تعدیہ لا سے ہوتا ہے۔

(۲) معتل العین میں تعدیہ بہ لا کی مثالیں ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ مثلاً سوکھنا سے سکھلانا، بیٹھنا سے بٹھلانا، دیکھنا سے دکھلانا، سیکھنا سے سکھلانا۔

(۳) صحیح میں صرف ایک فعل کا تعدیہ لا سے ہوتا ہے مثلاً کہنا سے کہلانا۔

---

[1] مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا عطیہ:۔ "لانا" اصل میں "لے + آنا" تھا۔ "لے آونا" سے "لیانا" اور "لانا" ہوگیا۔

(۴) متعدی بنفسہ جب متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، جیسے، بتانا، دینا، کہنا، تو لا کے الحاق سے وہ متعدی بہ سہ مفعول ہو جاتا ہے۔ جیسے، بتلانا، دلانا، کہلانا۔

لوا (۱) یہ بھی معتل اللام سے خاص ہے اور کلیہ یہ ہے کہ جہاں لا آتا ہے وہاں متعدی بہ سہ مفعول بنانے کے لئے لوا بھی آتا ہے، جیسے، دھونا سے دھلانا اور دھلوانا لیکن بتانا بتلانا سے بتلوانا نہیں آتا، دکھلانا اور دکھلوانا یہ شاذ ہے (؟)

(۲) معتل العین میں صرف ایک لفظ دیکھنا میں لا اور متعدی بہ مفعول کے لئے لوا دونوں آتے ہیں، جیسے دکھلانا اور دکھلوانا یہ شاذ ہے۔

(۳) صحیح میں بھی صرف ایک لفظ کہنا میں لا اور متعدی بہ سہ مفعول کے لئے لوا دونوں آتے ہیں جیسے کہلانا اور کہلوانا، یہ بھی شاذ ہے۔

ا (۱) معتل اللام کے صرف دو مصدروں کا تعدیہ الف سے ہوتا ہے جیسے چھونا سے چھوانا اور کھونا سے کھوانا۔ (؟)

(۲) معتل العین میں بیشتر اور (بھاگنا سے بھگانا)

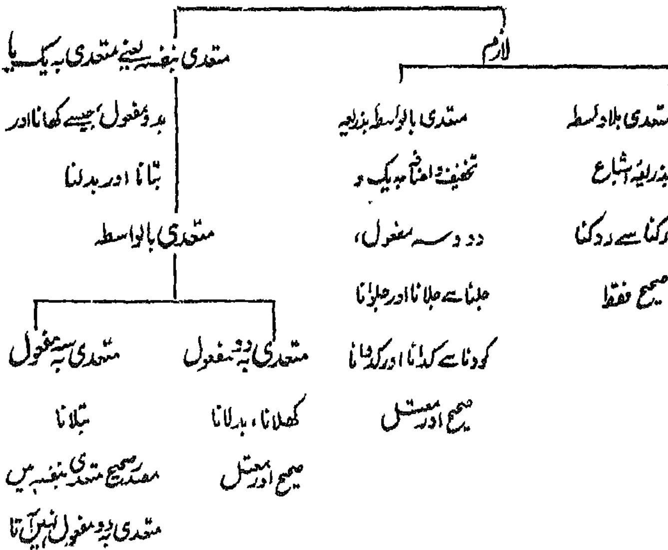
(۳) صحیح میں اکثر تعدیہ الف کے ذریعے ہوتا ہے (لکھنا سے لکھانا)

وا متعدی بہ سہ مفعول بنانے کے لئے معتل اللام میں اس کا استعمال کمتر اور معتل العین میں بیشتر اور صحیح میں اکثر ہوتا ہے۔

مثلاً بلانا سے بلوانا ، ناچنا سے نچوانا ۔

مصباح القواعد میں ایک اصطلاح متعدی بلا واسطہ بھی استعمال کی گئی ہے ص۳۳ اور اگرچہ وہ وہاں غلط طور پر استعمال ہوئی ہے ۔ لیکن ہے کام کی چیز ۔ اشباع کے ذریعے جن مصادر لازم سے متعدی بنائے جاتے ہیں ان کو متعدی بلا واسطہ کہہ سکتے ہیں چناں چہ مصادر کی حسب ذیل قسمیں ہوئیں ۔

مصدر



نوادر تعدیہ

تبدیل حروف (۱) دو مصادر پھوٹنا سے پھوڑنا اور ٹوٹنا سے توڑنا میں ٹ کو ڑ اور ت

سے بدل دیتے ہیں۔

(۲) بکنا سے بیچنا میں اشباع کے ساتھ حرف کی بھی تبدیلی ہوتی ہے۔

(۳) تبدیل حرکات

مصدر لازم سمٹنا اور لپٹنا میں س اور ل مکسور تھے، اشباع و امالہ کے بعد جب یہ متعدی بنے تو پہلے حرف مفتوح ہو گئے، سمیٹنا، لپیٹنا۔

---

(۴) ادھڑنا، اکھڑنا، اٹھنا، بکھرنا، سمٹنا، لپٹنا کا تعدیہ پہلے اشباع کے ذریعے ہوتا ہے، مثلاً ادھاڑنا، اکھاڑنا، اٹھانا، بکھارنا، سماٹنا، لپاٹنا، پھر ان سب میں الف شباع میں امالہ ہوا ہے۔ مثلاً:۔ ادھیڑنا، اکھیڑنا، اٹھنا، بکھیرنا، سمیٹنا، لپیٹنا اور یہی امالی صورتیں اردو میں مستعمل ہیں اور صرف اکھاڑنا اور اکھیڑنا میں شباعی اور امالی دونوں صورتیں مروج ہیں۔

انشا کی لغزش:۔ اکھڑنا سہ حرفی لفظ ہے اس میں پہلی حرکت ـُـ اور دوسری ـَـ ہے، کلیہ قاعدے کی رو سے اشباع دوسری حرکت ہی میں ہوگا۔ مثلاً اکھاڑنا، صحیح لازم مصدر کو الف تعدیہ کے ذریعے بھی متعدی بناتے ہیں، جیسے لٹکنا سے لٹکانا۔ اس لئے اکھڑنا سے اکھڑانا بھی متعدی کی ایک قسم موافق قیاس ہی ہوئی، لیکن

ممنوع نہیں، نتیجہ یہ کہ اکھاڑنا اور اکھڑانا دونوں موافق
قیاس ہیں ۔ صہ ۵۷ قاعدہ ۸

مجہول معنوی یا طور مجہول

مجہول کے صیغے مصادر متعدی کے ساتھ مصدر جانا کے مشتقات سے ترکیب پاکے بنتے ہیں، لیکن بعض حالتوں میں خود مصادر لازم بھی مجہول کے معنے دیتے ہیں۔ اور چونکہ ان کا ظاہر مجہول کا سا نہیں ہوتا اس لئے یہ مجہول معنوی یا بالفاظ "قواعد اردو" طور مجہول کہلاتے ہیں، جیسے اسپتال کی دایہ نوزائیدہ بچوں کو نہلانے لگی اور جب سب بچے نہا چکے یعنے نہلائے جا چکے یا بچے کتابیں پھاڑنے لگے اور جب سب کتابیں پھٹ گئیں یعنے پھاڑ ڈالی گئیں، ان جملوں میں نہانا اور پھٹنا مجہول معنوی یا طور مجہول ہیں۔

متعدی مصادر میں حرف معتل ساکن سے حرف علت حذف کر کے مجہول معنوی بناتے ہیں، جیسے چھاپنا، تولنا، گھیرنا سے چھپنا، تلنا، گھرنا، یعنے چھاپا جانا، تولا جانا، گھیرا جانا، یہ مصادر صورۃً مصادر لازم صحیح جیسے پلنا، رکنا، اور کھنچنا سے جو خود بھی بطور مجہول استعمال ہوتے ہیں کے مشابہ ہیں۔ پہلے صیغے مجہول معنوی کا کام دینے ہی کے لئے متعدی بنفسہٖ مصادر سے بنائے گئے ہیں۔ اور دوسرے صیغے جو فی الاصل لازم ہیں یہ طور مجہول معنوی استعمال ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔

معتل اللام

وہ مادّے جن میں حرف علت اصلی آخر میں ہوتا ہے (الف، واو، یا)

I تخفیف

لازم

(الف)	لا ۱	وا ۲	لوا ۳	(واو)	لا	لوا	(یا)	لا	لوا
آنا	..	..	..	رونا	رلانا	رلوانا	جینا	جلانا	جلوانا
اترانا	..	..	..	سونا	سلانا	سلوانا	(۱۳)		
جانا	..	..	..	ہونا	..	..			
چھانا (پھیلنا)	..		..						
سمانا	..	سمونا	..						
گھبرانا	..	..	..						
مرجھانا	..	..	..						
مسکرانا	..	..	..						
نہانا	نہلانا	..	نہلوانا						

قاعدہ:۔ حرف علت پر ختم ہونے والے لازم مادوں سے یا تو متعدی بالواسطہ بنے گا ہی نہیں، یا اگر بنے گا تو حرف علت کو عام قاعدے کے مطابق حذف کرکے لا یا لوا بڑھانے سے بنے گا۔ سمانا سے سمونا شاذ ہے۔

متعدی

(الف) لا لوا وا (واو) لا لوا وا آ (یا) لا لوا آ وا

بتانا جتلانا .. .. پینا پلانا پلوانا .. ..

ہلانا .. .. ہلوانا رونا .. .. لوانا .. دینا دلانا دلوانا .. ..

بھنانا[1] .. .. .. پرونا .. .. سینا سلانا سلوانا .. ..

پانا .. .. .. چھٹنا چھڑانا چھڑوانا .. چھڑانا لینا .. .. لانا لوانا

جتانا .. .. .. دھونا دھلانا دھلوانا .. ..

چھانا (سایہ کرنا) .. .. ڈھونا ڈھلانا ڈھلوانا .. ..

ستانا .. .. .. کھونا .. .. .. کھوانا

سجانا .. .. سجوانا

کمانا .. .. کموانا

کھلانا .. .. ..

کھانا کھلانا کھلوانا کھوانا[2]

گانا .. .. گوانا

گدلانا .. .. ..

لانا .. .. ..

قاعدہ:۔ حروفِ علت پر ختم ہونے والے متعدی بنفسہٖ مادوں سے متعدی بالواسطہ یعنے متعدی بدو یا بہ سہ مفعول کے صیغے کبھی بنتے ہیں اور کبھی نہیں۔ اور جب بنتے ہیں تو حروفِ علت کو عام قاعدے کے موافق حذف کر کے لا اور لوا یا وا بڑھانے سے بنتے ہیں

---

[1] سکہ بھنائیں گے بازارِ قیامت میں ضرور ؛ درہم داغِ محبت کے بھنانے والے
"جتنا روپیہ کاغذ میں لکھا ہے جہاں چاہو بھنالو" بنات النعش۔ [2] گنواروں کی زبان۔ صہبائی۔

معتل العین

وہ مادے جن میں حرف علت اصلی درمیان میں آتا ہے (الف، واو، یا)

تخفیف II

لازم

(الف)	آ	وا	(واو)	آ	لا	وا	و	شاذ	(یا)	آ	لا	وا	و	شاذ
بھاگنا	بھگانا	..	اونگھنا	..	..	..	..	..	بھیگنا	بھگانا	..	بھگوانا	بھگونا	..
جاگنا	جگانا	جگوانا	بھونکنا (کتا)		..	..	..	..	بیٹھنا	بٹھانا	بٹھلانا	بٹھوانا	..	بیٹھانا
جھانکنا	..	جھنکوانا	پھوٹنا	پھڑانا	..	پھڑوانا	..	پھوڑنا	پسیجنا	..	..	..	..	..
ناچنا	نچانا	نچوانا	ٹوٹنا	تڑانا	..	تڑوانا	..	توڑنا	پھیلنا	پھیلانا	..	..	..	..
پکارنا	..		ڈوبنا	ڈبانا	..	ڈبوانا	ڈبونا	..	پٹنا (رونا)	پٹانا[1]	..	پٹوانا[2]		..
			ڈولنا	ڈلانا	..	..	..	..	تیرنا	ترانا	..	..	..	..
			سوکھنا	سکھانا	سکھلانا	..	..		ٹھیرنا	..	..	..	..	ٹھیرانا
			کودنا	کدانا	..	کدوانا	..		جھینکنا (رونا)	..	..	..	..	
			گوندنا	..	..	..	..	..	چیخنا	..	..	..	..	..
			کھانسنا	..	..	..	..	..	ریجھنا	رجھانا	..	–	..	..
			گھومنا	گھمانا	..	..	..	..	لیٹنا	لٹانا	..	..	..	..
			لوٹنا	..	..	..	..	..	(۲۸)					

۱ہ ہے یکتائے جہاں اے رشک وہ آتش کا پرکالہ ٭ رلانے میں ہنسانے میں جلانے میں ستانے میں

۲ہ کہانی مرے درد کی کچھ نہ تھی ٭ مگر ایک عالم کو پٹوا گئی۔

متعدی

(الف)	آ	وا	طورِ مجہول	(واو)	آ	وا	طورِ مجہول	(یا)	آ	وا	لا	لوا	طورِ مجہول
بانٹنا	..	بنٹوانا	بٹنا	بِلنا	بلانا	بلوانا	..	بھیجنا	..	بھجوانا		..	..
باندھنا	..	بندھوانا	بندھنا	پھولنا	پھلانا	..	..	بیچنا	..	بکوانا	..	..	بکنا
پہچاننا	..	پہچنوانا		بھونکنا	..	..	..	بیلنا	..	..	..	..	..
ٹانکنا	..	..	ٹنکنا	بھوننا	بھنانا	بھنوانا	بھننا	پیٹنا	پٹانا	پٹوانا	..		پٹنا
چابنا	چبانا	چبوانا	..	پوجنا	پجانا	پجوانا	پجنا	پیسنا	پسانا	پسوانا	..		پسنا
چھاپنا	..	چھپوانا	چھپنا	پھونکنا	..	پھنکوانا	پھنکنا	پھینکنا	..	پھنکوانا	..		پھنکنا
ڈالنا	..	ڈلوانا	..	تولنا	تلانا	تلوانا	تلنا	پیلنا	..	پلوانا	..		پلنا
ڈانٹنا	..	..	..	ٹوکنا	..	..	..	جھیلنا	..	..	..	..	..
کاتنا	کتانا	..	کتنا	چھونکنا	..	..	..	جیتنا	جتانا	جتوانا	..	..	
کاڑھنا	..	کڑھوانا	کڑھنا	چھوڑنا	..	..		چھیننا	چھنانا	چھنوانا	..		چھننا
لادنا	لدانا	لدوانا	لدنا	چوسنا	چسانا	چسوانا	چسنا	دھکیلنا	..	..	..	..	..
مانگنا	منگانا	منگوانا	..	چومنا	..	..	..	دیکھنا	دکھانا	..	دکھلانا	دکھلوانا	دکھنا؟
ہارنا	ہرانا	..	..	چھوڑنا	چھڑانا	چھڑوانا		ریتنا	..	..	..	..	رتنا
ناپنا	..	..	..	ڈھونڈنا	..	ڈھنڈوانا		سیکھنا	سکھانا	..	سکھلانا	..	
				روکنا	..	..		کریدنا	..	..	..	..	..
				سینتنا	..	ستوانا	ستنا	کھیلنا	کھلانا	..	..	..	

متعدی

(واو)	آ	وا	طور مجہول
سوچنا	..	..	..
سونپنا	..	..	..
سونگھنا	سنگھانا	..	..
گوندھنا	..	گندھوانا	گندھنا
گھورنا	..	..	..
گھونٹنا	..	گھنٹوانا	..
گھوٹنا	گھٹانا	گھٹوانا	..
لوٹنا	لٹانا	لٹوانا	لٹنا
مونڈنا	منڈانا	منڈوانا	..
نچوڑنا	..	نچڑوانا	نچڑنا
ہونسنا (نظر لگانا)	..	..	

(یا)	آ	وا	لا	لوا	طور مجہول
گھیرنا	..	..	..	..	گھرنا
سینچنا	..	..	..	..	..
نبیڑنا	..	..	..	..	نبڑنا

(۶۰)



صحیح

صحیح وہ مصادر ہیں جن کے مادۂ فعل میں حرف علت نہیں ہوتا، ان کی دو قسمیں ہیں :۔

(۱) مصادر لازم جن کا تعدیہ یا صرف اشباع کے ذریعے ہوتا ہے جیسے پھٹنا سے پھاڑنا یا صرف اضافے کے ذریعے جیسے پڑھنا پڑھانا، یا اشباع کے ذریعے بھی اور اضافے کے ذریعے بھی جیسے، بچھڑنا، بچھیرنا، بچھڑانا۔

(۲) مصادر متعدی جن کا تعدیہ صرف اضافے کے ذریعے ہوتا ہے جیسے لکھنا، لکھانا

اشباع صرف مصادر لازم میں ہوتا ہے اور چوں کہ مادۂ فعل کا آخری حرف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے جیسے، مر، ٹل، دب، وغیرہ اس لئے دو حرفی مادے میں اشباع پہلے حرف کی حرکت میں ہوتا ہے جیسے مر سے مار اور سہ حرفی مادے میں ہمیشہ دوسرے حرف کی حرکت میں ہوتا ہے جیسے اُچھَل سے اُچھیل نہیں بلکہ اچھال اور بگڑ سے بیگڑ نہیں بلکہ بگاڑ آتا ہے۔

تعدیہ لازم بذریعۂ اشباع و اضافہ

مصدر	اشباعی حرکت	تعدیہ	تعدیہ	مصدر	اشباعی حرکت	تعدیہ	تعدیہ	مصدر	اشباعی حرکت	تعدیہ	تعدیہ
	ـَ	وا	آ		ـُ	وا	آ		ـے	وا	آ
ابھرنا	ابھارنا	..	ابھرانا ـ	جڑنا	جوڑنا	جڑوانا	جڑانا	بھرنا	پھیرنا	پھڑوانا	بھرانا
اترنا	اتارنا	اتروانا	اترانا ..	رکنا	روکنا	رکوانا	رکانا	چرنا	چیرنا	..	چرانا
اچھلنا	اچھالنا	..	اچھلانا	کھلنا	کھولنا	کھلوانا	کھلانا	کھنچنا	کھینچنا	کھنچوانا	..
بگڑنا	بگاڑنا	..	..	گھٹنا	گھونٹنا	گھٹوانا	..	گھسٹنا	گھسیٹنا	..	..

مصدر	اشباعی حرکت	تعدیہ	تعدیہ	تعدیہ
	ے	وا	آ	و
پلنا	پالنا	پلوانا	..	..
پھنسنا	پھانسنا	پھنسوانا	پھنسانا	..
تھمنا	تھامنا	..	..	..
ٹلنا	ٹالنا	..	ٹلانا	..
ٹنگنا	ٹانگنا	..	..	..
جھڑنا	جھاڑنا	جھڑوانا	جھڑانا	..
دبنا	دابنا	دبوانا	دبانا	..
کٹنا	کاٹنا	کٹوانا	کٹانا	..
گڑنا	گاڑنا	گڑوانا	گڑانا	گڑونا
مرنا	مارنا	مروانا	مرانا	..
مننا	ماننا	منوانا	منانا	..
نکلنا	نکالنا	نکلوانا	..	..
ادھڑنا	ادھیڑنا	ادھڑوانا	..	..
اکھڑنا	اکھاڑنا		..	..
	اکھیڑنا	اکھڑوانا	..	..
اینٹھنا	اینٹھنا	..	..	..
بکھرنا	بکھیرنا	..	بکھرانا	..
سمٹنا	سمیٹنا	..	سمٹانا	
لپٹنا	لپیٹنا	..	لپٹانا	..

ان مثالوں میں پہلے اشباع پھر الف لگا ہے، دیکھیں
لو اور تعدیہ

مصدر	اشباعی حرکت	تعدیہ	تعدیہ
	ے	وا	آ
کھلنا	کھولنا	کھلوانا	کھلانا
مڑنا	موڑنا	..	..

تعدیۂ لازم بذریعۂ اضافہ فقط

	آ	وا	ہ
اٹھنا	اٹھانا	اٹھوانا	..
اڑنا	اڑانا	اڑوانا	..
بجھنا	بجھانا	بجھوانا	..
بچھنا	بچھانا	بچھوانا	..
بدلنا	بدلانا	..	..
بڑھنا	بڑھانا	..	..
بسنا	بسانا	..	..
بٹنا	بٹانا	بٹوانا	..
بکھرنا	بکھرانا	بکھروانا	..
بھلسنا	بھلسانا		..
بھٹکنا	بھٹکانا	..	..
پگھلنا	پگھلانا	..	..
پلٹنا	پلٹانا	..	..
تڑپنا	تڑپانا	..	..
جلنا	جلانا	جلوانا	..
جھلسنا	جھلسانا		..

تعدیۂ متعدی بذریعۂ اضافہ فقط

	آ	وا	لا	لوا
بٹنا (رسی)		بٹوانا	ـ	..
بدلنا	بدلانا	بدلوانا	..	..
برتنا	برتانا	..	..	..
بھرنا	بھرانا	بھروانا	..	..
بھلسنا (بھونتا)	بھلسانا	..	..	..
پڑھنا	پڑھانا	پڑھوانا	..	..
پکڑنا	پکڑانا	..	..	..
پہننا	پہنانا	..	..	..
تلنا	..	..	..	..
جڑنا	جڑانا	جڑوانا	..	..
چکھنا	چکھانا	چکھوانا	..	..
چننا	چنانا	چنوانا	..	..
چھڑکنا	چھڑکانا	چھڑکوانا	..	..
خرچنا	..	..	..	..
دھرنا	دھرانا	دھروانا	..	..
ڈسنا	..	ڈسوانا	..	..

تعدیہ لازم بذریعہ اضافہ فقط

	آ	وا	و
چھپنا	چھپانا	چھپوانا	چھپونا
چلنا	چلانا	..	..
چمکنا	چمکانا	..	..
ڈرنا	ڈرانا	..	..
سجنا	سجانا	سجوانا	..
سمٹنا	سمٹانا	..	..
کڑھنا	کڑھانا	..	..
گرنا	گرانا	گروانا	..
لپٹنا	لپٹانا	..	..
لٹکنا	لٹکانا	..	..
لگنا	لگانا	لگوانا	..
ملنا	ملانا	ملوانا	..
ہلنا	ہلانا	..	..
ہنسنا	ہنسانا	..	..

تعدیہ متعدی بذریعہ اضافہ فقط

	آ	وا	لا	لوا
رٹنا	..	..	..	..
رکھنا	رکھانا	رکھوانا	..	..
سینا	سیانا	سیوانا	..	..
سمجھنا	سمجھانا	سمجھوانا	..	..
کچلنا	..	..	..	..
کرنا	کرانا	کروانا	..	..
کسنا	کسانا	کسوانا	..	..
کہنا	کہانا	کہوانا	کہلانا	کہلوانا
گندنا	گندانا	گندوانا	..	..
گھسنا	گھسانا	..	..	..
لانا	..	..	..	..
لڑنا	لڑانا	لڑوانا	..	..
لکھنا	لکھانا	لکھوانا	..	..
ملنا	ملانا	ملوانا	..	..
ملنا	..	ملوانا		
نگلنا	..	..	..	..

(جملہ مصادر سوا دو سو ۲۲۵)

اعلانِ نون

I حروفِ لین کے بعد اعلانِ نون بحالتِ مفردہ و مرکبہ جائز

ع فرعون کوئی بچا نہ نمرود

دلِ فرعون ، محبِ حسین ، قبلۂ کونین۔

II حروفِ مدّہ

مفرد

(ا) حروفِ مدّہ کے بعد اعلانِ نون الفاظ سہ حرفی ہیں۔

(۱) متاخرین کے پاس مستحسن ، مثلاً ، جگرؔ

ع اس خون کا ہر قطرہ ہے کونین کا حامل

(۲) قدما کے پاس مکروہ ، مثلاً غالبؔ

ع دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

(ب) تین سے زیادہ حروف والے الفاظ میں اعلانِ نون :-

(۱) متاخرین کے پاس مستحسن ، مثلاً جگرؔ

ع حیران ہوں میں جلوہ پھر کونسا باطل ہے

(۲) قدما کے پاس مکروہ ، مثلاً ، نسیمؔ ؎

سمجھا وہ کہ ہے شگون نرالا

یتولا پکڑ آستیں میں پالا

فائدہ :- جو الفاظ اردو محاورے میں بہ اعلان بولے جاتے ہیں ، مثلاً

پریشان، زبان، ارمان، دیوان، وغیرہ اور جوبہ اخفائے نون بولے جاتے ہیں مثلاً:۔ عریاں، دنداں، آشیاں، رضواں، وغیرہ، ان کے استعمال میں اعلان یا اخفا کی رعایت سے اساتذہ خواہ مخواہ مضمون کا خون نہیں کرتے۔

مرکّب

اساتذۂ فارسی (ایران) صرف عربی الفاظ میں نون کا اخفا کرتے ہیں، مثلاً، بیاں خفقاں، طلباں، مرجاں، وغیرہ

اساتذۂ دہلی عربی و فارسی دونوں قسم کے الفاظ میں نون کا اعلان بھی کرتے ہیں اور اخفا بھی۔

ناسخ نے صرف اخفا کو پسند و رائج کیا؛

"حقیقت یہ ہے کہ فارسی ترکیب میں اعلان نون بعد اضافت اب معیوب ہے"

نوٹ:۔ نون آخر کلمہ ایرانی تلفظ میں معلن ہوتا ہے، جیسے، جنبیدن مژگاں' کو ایرانی جنبیدن مژگن، پڑھے گا۔

اعجوبہ! اعلان نون کے مخالف لفظ " اعلان نون" میں نون کا اعلان کرتے ہیں۔

دستور الفصاحت

اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقیدی نظر

(ماخوذ از برہان دہلی بابت اپریل سنہ ۱۹۴۷ء)

اردو زبان کے قواعد پر قدما نے جو دو چار کتابیں لکھی ہیں ان میں میر انشاء اللہ خاں انشا کی دریائے لطافت کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ حالاں کہ اسی زمانہ میں سید احمد علی یکتا لکھنوی نے دستور الفصاحت کے نام سے اسی موضوع پر جو کتاب لکھی تھی وہ انشا کی کتاب کی طرح دلچسپ نہیں بہر حال فنی اور افادی حیثیت سے کسی طرح بھی اس سے کم نہیں کہی جا سکتی۔

اس کتاب کے شروع میں مصنف نے اردو زبان کی پیدائش ترقی اور اس کی وسعت سے بحث کی ہے۔ پھر چند ابواب اور ذیلی عنوانات کے ماتحت صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیے کے قواعد و ضوابط بیان کئے ہیں۔ خاتمے میں ۳۵ ایسے شاعروں کا ذکر ہے جن کے اشعار کتاب کے اندر بطور سند پیش کئے گئے ہیں لیکن اپنی اس افادیت اور اہمیت کے باوجود اس کتاب کی گمشدگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ خوش قسمتی سے مئی سنہ ۱۹۳۹ء میں اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ عالیہ رام پور کے لئے خرید کیا گیا اور کتاب خانے کے ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب کا مقدمہ اور خاتمہ اپنی تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کر کے اس خزانہ کو ارباب ذوق کے لئے عام

کردیا۔ علاوہ تصحیح و تحشیہ کے موصوف نے ایک نہایت فاضلانہ اور مفید و پُر از معلومات مقدمہ بھی لکھا ہے جو عام اربابِ ذوق اور تاریخ ادب اردو کے طلبہ کے لئے خاص طور پر بڑے کام کی چیز ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی کتاب کی ترتیب اور اس کے حواشی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

چوں کہ ہمارے اس مقالے کا خطاب براہِ راست کتاب کے فاضل مرتب سے ہے، اس بنا پر ضمیر غائب استعمال کرنے کی بجائے ہم نے جگہ جگہ "آپ" لکھا ہے۔

دیباچہ مصحح

(واوین میں جو عبارتیں ہیں وہ دستور الفصاحت کی ہیں اور بقیہ الفاظ میرے اپنے)

مخطوطے کے جملہ ورقوں کی تفصیل یوں لکھی ہے ص۱۲

شروع کے فاضل + درمیان کے اصل + آخر کے فاضل

۲ + ۲۱۹ + ۱ = ۲۲۲ جملہ ورق

ص۱۲ "ورق ۳ ب سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے" حالانکہ کتاب کا آغاز ۳ الف سے ہوا ہے
ص۲۳ "اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعہ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۳۹ لکھے گئے ہیں"
اور متن مطبوعہ میں مندرجہ ہندسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی ۲۲۱ ب صحیح ہے لیکن دیباچے کے ص۲ کی پہلی سطر میں خاتمے کے ہندسے ۲۱۹ ب لکھے ہیں "خاتمہ (ورق ۱۸۷/ الف - ۲۱۹/ ب)" یہ کمپوزنگ کی معمولی غلطیاں ہیں۔

مخطوطے میں مختلف تحریریں ص۱۲ "ورق ا ب اور ۲ الف پر کاتب کا تھوڑا سا دیباچہ نقل کیا گیا ہے" اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کتاب کا جو اصل دیباچہ ۳ الف سے شروع

ہوا ہے (یہیں صیغہ عبودیت) اسی کا تقریباً ڈیڑھ صفحہ فاضل اوراق پر نقل کیا گیا ہے، اگر یہ دیباچہ اصل دیباچے سے مختلف ہوتا تو آپ لکھتے کہ ایک "ادھورا" دیباچہ" لکھا ہے۔ بہر حال اس کی صراحت ضروری ہے اور مخطوطے میں اس تھوڑے سے دیباچے کے بعد دو قطعے لکھے ہیں اور ان کے نیچے لکھا ہے "کاتب الحروف بندہ شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری" جس طرح آپ نے اکبر پور کا محل وقوع لکھا ہے (صلہ ۹۹) اسی طرح اگر موتیہاری کا محل وقوع بھی تحریر فرماتے تو قارئین کو واقعات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی۔

ص۱۳ "آخر میں کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے الکاتب لخاتمہ ہدایت علی لمرہانی" مگر یہ صرف خاتمہ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی ابواب کے کاتب کا نام مذکور نہیں ہے غالباً وہ شیخ دلاور علی بہاری ہوگا۔"

میری رائے میں اگر دلاور علی ابتدائی ابواب کا کاتب ہوتا تو اس کا نام غلطے سے پہلے ص۱۸۷ پر لکھا ہوتا کیوں کہ جو شخص ڈیڑھ صفحہ اور دو قطعے لکھنے کے بعد اپنا نام لکھنا ضروری سمجھے وہ ۱۸۴ صفحے لکھنے کے بعد ضرور اپنا نام لکھتا یا اگر دلاور علی کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ملتی ہو تو وہی اس کا کاتب قرار دیا جا سکتا ہے اور جب آپ نے لکھا ہے کہ مرہانی صرف خاتمہ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے تو خاتمے کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ضرور مختلف ہوگی۔

ص۱۲ "پہلے صفحے پر سیاہ مربع مہر ہے۔ مہر کے اندر "اللہ حافظ مہر کتاب خانہ محمد مروان علی خان رعنا ۱۲۸۲ھ" منقوش ہے"

ص۱۳ "۳ الف کے بائیں گوشے میں" مولفہ سنہ ۱۲۴۹ھ از تالیف سید مظفر علی کیا لکھنوی" لکھا ہے۔ غالباً یہ رعنا کے قلم کی تحریر ہے اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں

قطعۂ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۴۹ لکھے گئے ہیں"

ص۱۳ ورق ۱۴۵ ب اور ۱۷۳ الف کے حاشیوں پر جو ترمیم واضافہ ہوا ہے وہ آپ کی رائے میں یکتا کے قلم سے ہے۔

ص۱۵ آخر میں ایک ورق منضم ہے، جس پر حشی کا ایک نسخہ "جناب حکیم سید احد علی خاں صاحب قبلہ کا تجویز کیا ہوا درج ہے"

خلاصہ یہ کہ اب تک مخطوطے کی مختلف تحریروں کے جو کاتب آپ نے معین کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) ۱ب ۲۰ الف تھوڑا سا دیباچہ مع دو قطعات ..... کاتب شیخ دلاور علی بہاری بمقام نیوہاری

(۲) ۳ الف ۱۸۷ الف ابتدائی ابواب ...... کاتب غالباً شیخ دلاور علی۔

(۳) ورق ۱۴۵ ب اور ورق ۱۷۲ الف پر ترمیم و اضافہ بشرطیکہ حاشیے کا خط متن کے خط سے نہ ملتا ہو، کاتب یکتا۔

(۴) ۱۸۷ الف ۔ ۲۱۹ ب خاتمہ .... کاتب ہدایت علی موہانی۔

(۵) ۳ الف اور ۲۱۹ ب .... کاتب غالباً رعنا۔

(۶) ۲۲۲ الف حشی کا نسخہ .... کاتب نامعلوم۔

ان تحریروں کے پیش نظر آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے:-

ص۱۵ سطر ۲ - ۱۰ - "میرا خیال ہے کہ ہمارا نسخہ (ج) مصنف کے اس نسخے (ا) کی نقل ہے۔ (ب) جو رمضان علی لکھنوی نے تیار کیا تھا" یعنی یکتا نے پہلے ایک مسودہ لکھا اس کو آ کہئے پھر اس کو رمضان علی نے نقل کیا، اس کو ب کہئے اب جو نسخہ آپ کے پیش نظر ہے وہ ب کی نقل ہے، اس کو ج کہئے اور ساری بحث

اسی نسخۂ ج سے متعلق ہے :

غالباً اس میں (ب) بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے جن کے مقابل حاشیے پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا " یعنی نسخۂ ب کے حاشیوں پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا یعنی مصنف کی اس سعی کے باوجود کہ نظر ثانی کرتے وقت اس کو حسب خاطر درست کرے، بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے۔

" ہمارے نسخہ (ج) کے کاتب نے حاشیے کی عبارتوں کو بھی بعینہٖ نقل کر لیا جب یہ نسخہ (ج) مصنف نے دیکھا تو حاشیوں کو قلمزد کر کے متن میں ان مقامات کی تصحیح کر دی "

یعنی جب نسخۂ ج کو جو آپ کے پیش نظر ہے یکتا نے دیکھا تو الخ

" نیز اس نظر میں وہ غلطیاں بھی درست کر دیں جو پہلے نسخے کے مطالعے کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں " یعنی نسخۂ ج کو دیکھتے وقت مصنف نے وہ غلطیاں بھی درست کر دیں جو نسخۂ ب کے مطالعے کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں نتیجہ یہ کہ :-

(۱) آپ کے پیش نظر جو نسخہ ج ہے وہ یقیناً شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا نسخۂ ب نہیں ہے۔

(۲) نسخۂ ج میں یکتا نے جابجا اپنے قلم سے اصلاح دی ہے۔

(۳) نسخۂ ج میں یکتا نے امکان بھر کوئی غلطی نہ رہنے دی۔

پہلے نتیجہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ آپ کے پیش نظر جو نسخہ ہے اس کے ابتدائی ابواب رمضان علی ہی کے لکھے ہوئے ہیں جیسا کہ یکتا نے لکھا ہے۔

" مخفی مباد کہ عرصۂ بعید و مدت مدید سپری گردیدہ کہ چہرہ

تسطیرِ ایں مقالہ وگردہ تصویرایں رسالہ بر صفحہ وجود نقش گرفتہ..... وسالہا
سال ببستر مرض گرد طبیعت متوجہ نشد کہ بنظر ثانی پرداز دیا آں را بنحوی کہ منظور
بود درست سازد کہ دوستی از دوستان فقیر مسمّٰی بہ شیخ رمضان علی سلمہٗ ربہ
از باشندگانِ لکھنؤ کمر ہمت بستہ بنقلش پرداختند"

رسالے اور مقالے سے مراد صرف ورق ۳ الف تک ہے اور "بنحوی کہ منظور بود درست سازد" سے مراد فہرست مضامین و خاتمہ و تصحیح و تحشیہ وغیرہ ہے اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ ہر مصنف کی طرح یکتا نے بھی متعدد مرتبہ مسودے میں کاٹ چھانٹ کی تھی، لیکن پھر بھی جیسی کہ چاہیے تصحیح نہ کر سکا تھا اور آپ بھی نظر ثانی کو صفحہ ۲۷ سطر ۱۵ میں تسلیم کرتے ہیں۔

یکتا کے اس مسودے میں ورق ۱۴۵ ب پر استفہام تقریری کی بحث میں میر سوز کا یہ شعر متن کے اندر مذکور تھا ؎

تو جو کہتا ہے گلہ میرا کیا جس تس کنے ٭ کب کیا، کس جا کیا، کس وقت، کس دم، کس کنے

اس شعر کے محاذ میں حاشیے پر لکھا تھا "معلوم باد کہ شعر میر سوز مشتمل بر استفہام انکاری بود از سہو خود در تقریری نوشتہ شدہ" شیخ رمضان علی نے اس کو جوں کا توں نقل کر لیا۔ اور اس عبارت کے بعد لکھ دیا "النقل کا الاصل" چوں کہ کہیں شعر کو بے محل لکھنا اور حاشیے پر خواہ مخواہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بیجا تکلف ہے۔ یکتا نے اس کو بہت مدت کے بعد محسوس کیا اور بیضے میں دونوں عبارتیں کاٹ دیں۔

اگر یکتا پہلے ہی یہ کام کرتا یعنی مسودے میں اس شعر پر یہاں خط کھینچ کر اس کو استفہام تقریری کی مثال میں لکھ دیتا تو کس قدر زحمت سے بچتا۔ اب آپ فرماتے ہیں:

کہ مسودے میں یہ شعر استفہام تقریری کی بحث میں مذکور تھا۔ رمضان علی نے اس کو عین میں لکھ دیا۔ یکتا نے جب مبیضہ دیکھا تو شعر کو کاٹ کر قصہ چکانے کی بجائے اس پر ایک نوٹ لکھا، یہ تمام عبارتیں ایک دوسرے کاتب نے نقل کر لیں۔ یعنی "النقل کالاصل" اس دوسرے کاتب نے لکھا ہے اور جب یہ دوسری نقل یکتا نے دیکھی تو اس وقت اس نے وہی کام کیا جو وہ پہلے ہی کر سکتا تھا، یعنی متن میں کا شعر اور حاشیے پر کا اپنا لکھا ہوا نوٹ اور دوسرے کاتب کا نوٹ ان سب کو قلم زد کر دیا، جو بات آپ دوسری نقل میں تسلیم کرتے ہیں اس کو پہلی ہی نقل میں تسلیم کر لینے میں کون امر مانع ہے۔

میرے قیاس میں ورق ۱۰۷ الف پر جو رباعی مسودے میں لکھی تھی اس کو رمضان علی نے ہو بہو نقل کر لیا۔ مصنف نے اس کو قلم زد کر کے دوسری رباعی حاشیے پر لکھ دی۔ اب آپ کے قیاس کے مطابق اس کی توجیہ یہ ہوگی۔ یکتا نے یہ رباعی مسودے میں لکھی تھی۔ شیخ رمضان علی کے مبیضے میں وہ نقل ہو گئی۔ یکتا نے جب اس مبیضے کو دیکھا تو رباعی میں ترمیم کا خیال آیا یہاں تک کہ وہ مبیضہ دوبارہ نقل ہو کر یکتا کے سامنے آیا تب اس نے متن میں رباعی پر خط کھینچ کر حاشیے پر اصلاح شدہ رباعی لکھ دی۔

اگر میرا قیاس درست ہے تو ورق ۱۴۵ ب کے حاشیے پر جو نوٹ ہے اس کا اور متن کا ایک ہی خط ہونا چاہیے کیونکہ دونوں خط رمضان علی کے ہیں، اور متن میں کسی اور جگہ خط نسخ میں کوئی تحریر ہے تو وہ بھی "النقل کالاصل" کے خط سے ملنا چاہیے۔ لیکن حاشیے پر کی رباعی کا خط متن کے خط سے ضرور مختلف ہونا چاہیے کیونکہ یہ یکتا کی تحریر ہے۔

خاتمہ لکھے جانے کے بعد یکتا نے اس کو ہدایت علی الموہانی سے لکھوایا

پھر یہ کتاب انقلاب زمانہ سے بہار پہنچی، اور وہاں سے مراد آباد ہوتی ہوئی رامپور آئی۔ شیخ رمضان علی نے جن وجوہ سے مسودے کی نقل کی ہے ان کے پیش نظر یہ بالکل غیر مناسب ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ آخر میں کاتب کی حیثیت سے اپنا نام لکھتا خصوصاً جب کہ مصنف خود احسان ماننے اور اعتراف کرنے کے لئے تیار تھا۔

اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ حاشیے پر کی رباعی کا خط متن کی رباعی کے خط سے مختلف نہیں ہے تو "دستور الفصاحت" کا موجودہ نسخہ نہ شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا ہے اور نہ اس میں کہیں یکتا نے اپنے ہاتھ سے اصلاحیں دی ہیں بلکہ کسی کاتب نے رمضان علی کے نسخے کو جس میں یکتا کی اصلاحیں تھیں ہوبہو نقل کر لیا تاکہ اس تصنیف کی ترقی کے مدارج محفوظ رہ جائیں۔ اور مصنف کی اس آرزو کے پیش نظر "بنحوی کہ منظور بود درست سازد" اگر "کہیں کہیں متن کے اندر یا حاشیوں میں کتابتی غلطیوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے "تاہم متن میں بہت سی املائی غلطیاں باقی ہیں" ص۱۳۱

.... تو ماننا پڑتا ہے کہ یکتا کے قول و فعل میں یکسانی نہیں تھی اور وہ کوئی ذمہ دار اور محتاط مصنف یا مصحح نہیں تھا اور اختلاف خطوط کی صورت میں یکتا پر کوئی اعتراض نہیں۔ ایک دو قیاس یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جیسا کہ اشرف علی خاں فغاں کے مرتب کردہ انتخاب میں مرزا فاخر مکین نے "جابجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا، کہیں تیغ اصلاح سے زخمی کر دیا تھا"۔ (آب حیات ص۱۲۵) اور جیسا کہ گلزار ابراہیم قلمی کے متن میں مصنف کے سوا کسی اور شخص نے بھی معتدبہ اضافے کئے ہیں (ماخذ حواشی ص۷) جیسا ہی ممکن ہے کہ دستور کے مخطوطے میں بھی کسی نے تصرفات کئے ہوں، اس صورت میں جب تک کہیں یکتا کی کوئی اور تحریر نہ مل جائے

یا کسی اصلاح کے نیچے ان کا دستخط نہ ہو۔ ساری قیاس آرائیاں صرف قیاس آرائیاں ہی رہیں گی اور آپ جس تفصیل سے دستور الفصاحت کے مخطوطے کا تعارف کرانا چاہتے ہیں اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اس میں جتنے طرح کے خط ہیں ان کے کاتب معین کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ مخطوطہ کن کن کے پاس سے اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا رام پور پہنچا ہے۔

دستور الفصاحت کے مختلف کاتبوں اور خطوں کی آپ نے جو بحث چھیڑی ہے اس کا قطعی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ نسخہ یا اس کے متعدد عکسی نسخے مختلف نقادوں کے پیش نظر نہ ہوں۔ اب جو کچھ بھی بحث ہو سکتی ہے اس کا انحصار آپ کی تحریر کے اس مفہوم پر ہے جو پڑھنے والے کی سمجھ میں آئے۔ اب اگر آپ کا بیان اس قدر مستقل ہے کہ پڑھنے والا وہی ایک بات سمجھنے پر مجبور ہے جو آپ سمجھانا چاہتے ہیں تو پڑھنے والے کی سمجھ میں بھی وہی بات آئے گی جو آپ نے سمجھی ہے اور اگر عبارت پہلو دار ہو گئی ہے تو پڑھنے والا نہ تو نسخے کی اصل کیفیت ہی سمجھ سکتا ہے اور نہ آپ نے جو سمجھا ہے وہی معلوم کر سکتا ہے۔ یعنی ساری بحث کا اصل کتاب سے وہی تعلق ہے جو آپ کی تحریر کا اس سے ہے۔

دستور کے اختتام کی تاریخ | ص۲۲ " ان پانچ شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سنہ ۱۲۲۹ھ اور سنہ ۱۲۳۰ھ کے درمیان تمام ہو چکی تھی" حالانکہ ان میں کی چار شہادتیں (قتیل[۱]، شاہ نصیر[۲]، میر تقی[۳]، مرزا جعفر) خاتمے یعنی تذکرۃ الشعراء سے متعلق ہیں اور مقدمے میں جو مرزا جعفر کا نام آیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے۔

مقدمہ صہ مرزا جعفر کے نام کے بعد "مغفور اندلازال دولتہ واقبالہ"
لکھا ہے اور کوئی دعا قلم زد نہیں اسی صفحے پر مرزا حاجی کے نام کے ساتھ دام اقبالہ ہے
خاتمہ صہ، مرزا جعفر کے نام کے بعد "دام اقبالہ اذ مغفور و مرحوم ہے اور
دام اقبالہ" قلم زد ہے۔
خاتمہ صہ شاہ نفیر کے احوال میں مرزا حاجی کے لئے نہ کوئی القاب ہے
نہ کوئی دعا، لیکن اس کا اقتباس جو آپنے دیباچے کے صہ پر لکھا ہے اس میں
" دام اقبالہ" موجود ہے۔
خاتمہ صہ مرزا حاجی کے نام کے بعد "دام ظلہ واقبالہ" اور مرزا جعفر کے
نام کے بعد " دام اقبالہ" لکھا ہے۔
خلاصہ یہ کہ مرزا حاجی کی وفات سنہ ۱۲۷۵ھ میں ہوئی اور دستور پر
نظر ثانی سنہ ۱۲۴۹ھ میں۔ اس لئے ان کے نام کے ساتھ مغفرت کی دعا کیوں کر آسکتی
تھی اور جس وقت رمضان علی نے اس کی نقل لکھی۔ مرزا جعفر مر چکے تھے اور جہاں
کہیں مرزا جعفر کا نام آیا ہے اور جو تعریفی اور توصیفی لفظ استعمال ہوئے ہیں، ان
سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان کی زندگی میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے سب جگہ ان کی
درازیٔ عمر کی دعا آئی ہے اس لئے یا تو سب جگہ دعائے مغفرت لکھی جانی چاہیئے
تھی یا کہیں نہ لکھی جاتی۔ اب ایک جگہ دونوں دعائیں بحال ہیں (خاتمہ صہ) ایک جگہ
صرف دعائے مغفرت بحال ہے (صہ) اور ایک جگہ صرف دعائے زندگی (صہ) تو
یہ سب شیخ رمضان علی کی کتابت اور یکتا کی تصحیح نقل میں ساتھ کے کرشمے ہیں؛
البتہ جہاں دعائے بقا قلم زد کر کے دعائے مغفرت بڑھائی گئی ہے وہاں خط کے

اختلاف سے ان کے لکھنے والوں کا پتا مل سکتا ہے ۔

ص۲ "ان دونوں شہادتوں سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ کتاب سنہ ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی" یہ شہادتیں احسن اللہ بیان اور قائم کے متعلق ہیں اور ان کا تعلق بھی تذکرۂ شعرا سے ہے نہ کہ (قواعد صرف و نحو و عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع) اصل کتاب سے اور اس تذکرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو یکتا نے سنہ ۱۲۱۳ھ سے پہلے ارادی یا غیر ارادی طور پر لکھنا شروع کر دیا تھا اور برابر لکھتا رہا، یہاں تک کہ سنہ ۱۲۳۰ھ و سنہ ۱۲۲۹ھ کے بعد ہی اس کو ختم کر دیا گیا۔ تذکرے میں جن شعرا کا مذکور ہے ان کی موت و حیات سے تذکرے کی ابتدا و انتہا کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، بیان کی وفات اگر سنہ ۱۲۱۳ھ میں ہوئی ہے اور تذکرے میں اس کو "تا حال زندہ است" لکھا ہے تو اس سے صرف اتنا نتیجہ نکلتا ہے کہ بیان کا احوال سنہ ۱۲۱۳ھ سے پہلے قلمبند ہوا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ اس سنہ میں تذکرہ ہی ختم کر لیا گیا تھا۔ اور پھر سنہ ۱۲۱۳ھ کی بنا پر یہ کہنا کہ "دستور الفصاحت" کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے (سنہ ۱۲۲۲ھ) انجام پا چکا تھا" ص۲ اور یہ کہ "مصنف کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی معرض وجود میں نہیں آئی تھی" ص۲۵ خود یکتا کے اس جملے کے ہوتے "غواص بحر فصاحت" "صاحب دریائے لطافت" (ص۱۰۳ خاتمہ) حقیقت سے بعید ہے :

یکتا کے اس جملے میں دو باتیں اظہر من الشمس ہیں۔ (۱) انشا کا احوال تذکرۃ الشعرا میں سنہ ۱۲۲۲ھ کے بعد لکھا گیا ہے یا کم از کم یہ ٹکڑا اس سنہ کے بعد بڑھایا گیا ہے (۲) انشا دریائے لطافت کے مصنف کی حیثیت سے اس قدر مشہور

ہو چکے تھے کہ ان کے نام کے ساتھ اس تصنیف کا ذکر لازمی ہو گیا تھا۔ یکتا کو اتنی بھی رعایت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس نے یہ سن کر کہ یمین الدولہ نے انشا کو قواعد و مصطلحاتِ زبانِ اردو لکھنے کا حکم دیا ہے، خود بھی انہیں مرتب کرنے لگ گیا ہو۔ کیونکہ دستور کا مقدمہ دیکھنے سے صاف پتا چلتا ہے کہ یکتا نے دریائے لطافت کے مقدمے اور دردانۂ اول و دوم وسوم اور باغ در ذکر فوائد دیگر کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ دریائے لطافت فارسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو کے صفحوں کے حوالے سے چند اہم مطالب مقام درجِ ذیل ہیں۔ ان کی مطابقت سے ان تصانیف کی تقدیم و تاخیر واضح ہو جائے گی۔ توارد کی بھی ایک حد ہوتی ہے:

مضامین	دستور	دریا
فردوس آرام گاہ	۶	۳۷
سودا	۶	۲۲
مرزا جان جاں	۶	۱۷
سنی	۷	۳۴
خنجر	۷	۷
تعریف محاورہ و لفظ و تعریف ردو	۹	۳۷
ولی		۲۴۱
سفیل	۹	۲۴۲

پھر بھی اگر یکتا فرماتے ہیں کہ "ہیچ کتابی از کتب این فن...... در نظر نداشتم الخ" تو اس کی صداقت بھی قائم کے اس قول سے کہ "الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال

شعرائے ریختہ کتابی تصنیف نگر دیدہ" ملتی جلتی ہے۔

۲۔ "ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشا اللہ خاں انشا کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قتیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں تمام ہوئی تھی۔" مجھے اس جملے کے خط کشیدہ حصے سے اتفاق نہیں۔ دریائے لطافت بلاشبہ من حیث الکل قتیل کی مدد سے لکھی گئی ہے، لیکن قواعد اردو اور مصطلحات زبانِ اردو میں قتیل کا کوئی حصہ نہیں۔ انشا نے ازراہِ کسرِ نفسی اپنی فارسی عبارت تک میں اصلاح دینے کا قتیل کو اختیار دیا ہے لیکن وہ اس کے روادار نہیں کہ قتیل قواعد و مصطلحاتِ زبانِ اردو میں کوئی ادنیٰ سا تصرف بھی کرے۔ مرشدآبادی نسخے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"این ہمہ فرصت بدست نیامد کہ تنہا رنگ برچیدن این نقش بدیع کشم مرزا محمد حسین قتیل را نیز کہ رو کردہٗ او بے تامل رد کردہٗ من و پسندیدہٗ او پسندیدہٗ این کثرٔ زبان بودہ است و از صغر سن میانۂ من و او را در ہر چیز حصہ برادرانہ قرار یافتہ شریک این دولت ابد مدت ساختم و باہم چنین مقرر شد کہ خطبۂ کتاب و لغت و محاورہ اردو ہر چہ صحت و سقم آن باشد و مصطلحات شاہجہان آباد و علم صرف و نحو این زبان را راقم مذنب یعنی کمترین بندۂ درگاہِ آسمان جاہ انشا بنویسد و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع را او بقیدِ قلم درآورد و چون بندہ را بیشتر با نظم سروکار بندہ و او را با نظم و نثر ہر دو چند سطری کہ نویسم نگاہداشتن آن نیز موقوف بو پسند او ست سوائے لغات

و محاورہ و اصطلاح اردو فلش در عبارت ہمہ مقبول خاطر فقیر گشتہ ؎

اس لحاظ سے یہ کہنا کہ "قتیل نے ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب لکھنے میں انشا کی مدد کی"، حقیقت کے خلاف ہے۔

اس کتاب کی وجہ تصنیف | بعضے عزیزاں و شفیقاں بنوشتن قواعد صرف و نحو وغیرہ بطرزیکہ اجرائے آنہا بزبان ہندی موافق محاورۂ اردو بودہ باشد اکثر تکلیف می کردند و راقم چوں قدرت تحریر آں بمرتبہ کہ پایہ ایں اعتبار را شاید در خود نمی دید۔ متامل بود کہ دریں اثنا ..... مرزا حاجی صاحب ..... نیز باصرار فرمودند۔ ناچار امتثالاً للامر بتسوید رسالہ پرداختم، و ہر قدر کہ نوشتم قواعد مسطورہ از فارسی نقل نمودہ بہ ہندی مطابق ساختم پس مسمیٰ گردانیدم مجموعۂ مذکورہ را بہ "دستور الفصاحت" و مرتب نمودم ترتیبش را بمقدمہ و پنج باب و خاتمہ ؎

مقدمے کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جوہر شناس احباب مدت سے تقاضا کر رہے تھے کہ یکتا قواعد صرف و نحو اردو پر نہ کہ احوال شعرا پر ایک رسالہ لکھے لیکن وہ کسر نفسی سے اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا، یہاں تک کہ مرزا حاجی نے بھی اصرار کے ساتھ اس تصنیف کی فرمائش کی تو یکتا نے مجبور ہو کر اس کو لکھنا شروع کیا "ناچار امتثالاً للامر بتسوید رسالہ پرداختم" اور قواعد اردو کو قواعد فارسی کے سانچوں میں ڈھالنے لگا۔ ان مراحل کے بعد اس نے اس کتاب کا نام "دستور الفصاحت"

رکھا۔ "پس مسمیٰ گردانیدم مجموعۂ مذکور را بہ دستور الفصاحت"

یعنی کتاب کے مطالب یکتا کے ذہن میں خواہ کتنی ہی مدت سے رہے ہوں لیکن اس نے انہیں سنہ ۱۲۲۹ھ یا سنہ ۱۲۳۰ھ میں مرزا حاجی کے حکم سے قلمبند کرنا شروع کیا پھر جب اس کا خاکہ تیار ہوگیا تو کئی وجوہ سے سالہا سال تک حسب دلخواہ نظرِ ثانی کر کے اس میں رنگ بھرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔

" عرصۂ بعید و مدت مدید سپری گردیدہ کہ چہرۂ
تسطیر ایں مقالہ وکردہ تصویر ایں رسالہ بر صفحہ وجود نقش گرفتہ
سبب تردد خاطر .... در محل تعطل افتادہ بود. و در تعطیل
کہ سالہا سال بسر آمدہ ہرگز طبیعت متوجہ نشد کہ بہ نظر ثانی
پردازد یا آں را بنحوی کہ منظور بود درست سازد"

یعنی انیس ۱۹ برس تک یہ کتاب مسودے کی حالت میں رہی اور سنہ ۱۲۴۹ھ میں اس کا تاریخی نام رکھا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حاجی کے حکم سے جب کتاب لکھی جانے لگی تھی تو "قواعد صرف و نحو اردو" کے سوا کوئی اور نام مصنف کے ذہن میں نہیں تھا۔ اگر بقول آپ کے یہ کتاب ذہنی طور پر نہیں بلکہ خارجی طور پر سنہ ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی تو یکتا نے اپنے اس بیان میں کہ ناچار "امتثالاً للامر بتسوید رسالہ پرداختم" صریح جھوٹ کہا ہے اور آپ یکتا کو اس مقام میں جھوٹا تسلیم کر لیں جو ناگزیر ہے تو پھر آپ اس کی کس بات کی حمایت میں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔

رقعات قتیل "معدن الفوائد" سے پتا چلتا ہے کہ "دریائے لطافت" کی متعدد نقلیں لکھی جا چکی تھیں اور یہ امر ناممکن ہے کہ آٹھ برس (۱۲۲۲ - ۱۲۳۰) بلکہ ستائیس

برس (۱۲۲۲ - ۱۲۴۹) کے عرصے میں باوجود اس شہرت اور اعتراف شہرت کے یکتا نے دریائے لطافت کا مطالعہ کرنا ضروری نہ خیال کیا ہو اور یوں خیال کرنا یکتا پر ظلم کرنا ہے۔ علاوہ یکتا کے اس بیان کے۔

"ہیچ کتابی از کتب ایں فن و رسائل ایں ہنر کہ مفید مطلب و معین مقصد دریں باب می شد در نظر نداشتم کہ موافق آں نوشتم و از خطا مصئون می ماندم"

یہ معنی کہاں نکلتے ہیں کہ یکتا نے اس فن صرف و نحو اردو کی سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں دیکھی تھی یا کوئی ایسی کتاب صرف وجود ہی میں نہ آئی تھی بلکہ یکتا کا کہنا یہ ہے کہ "اس فن پر ملکیوں اور غیر ملکیوں کی کتابیں تو بہتیری ہیں مگر میں جس طرز پر لکھنا چاہتا تھا اس طرز کی یا اس پائے کی کہ میں اس سے استفادہ کروں یا اس کے نقش قدم پر چل کر غلطیوں سے محفوظ رہوں، کوئی کتاب میری نظر میں نہیں تھی" اس نے صاف صاف لکھا ہے کہ :-

"اس فن کی کتابوں میں سے کوئی کتاب یا اس ہنر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ جو اس بارے میں مفید مطلب و معین مقصد ہو میری نظر میں نہیں تھا کہ میں اسی کے موافق لکھتا اور غلطیوں سے محفوظ رہتا"

کسی فن کی کتابوں اور رسالوں کو دیکھے بغیر ایک مصنف کیسے کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی مفید مطلب اور معین مقصد نہیں، پھر کسی فن پر اس فن کی کتابوں سے جو پہلے سے موجود ہوں آنکھیں بند کر کے لکھتے چلے جانا اور یہ سمجھنا کہ

بس قواعد صرف و نحو اردو میں کسی افکار کے محتاج ہیں یا جہالت سے اور خدا کا شکر ہے کہ یکتا نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ بخلاف اس کے قائم کی ڈھٹائی قابل داد ہے۔ کس دلیری سے لکھتا ہے۔

"الی الآن در تذکرہ بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابی
تصنیف نگردیدہ، لہٰذا ایں زماں ہیچ انسانی از ماجرای شوق افزای
سخنوران ایں فن سطری تالیف نرسانیدہ۔"

اب یکتا نے جو یہ کہا ہے کہ دریائے لطافت بھی دستور فصاحت کی تصنیف میں مفید و معین نہ ہو سکی یا یہ کہ دستور بہ نسبت دریا کے بہت جامع اور فنی کتاب ہے اس کی تصدیق یا تکذیب دنیائے ادب اسی وقت کر سکتی ہے جب اس کے سامنے پوری کتاب چھپ کر آئے اور وہ بذات خود اس پر کوئی رائے قائم کر سکے، اب اس پر جو کوئی بھی جو کچھ بھی رائے قائم کرے گا اس کی بنیاد آپ کی رائے پر ہو گی۔

خاتمے کی وجہ تصنیف

"خاتمہ در تذکرۃ الشعراء یعنی در بیان اسامی و قدری احوال بعضی از شعرا کہ بتقریب مثال۔ کلام فصاحت نظام ایں بزرگواران دریں رسالہ مندرج گردیدہ تا مطالعہ کنندہ را از حالت و قوت مرتبہ ہر یک فی الجملہ وقوف و آگہی بودہ باشد۔"

اصل تصنیف سے خاتمے کا صرف اتنا تعلق ہے کہ اس کے پڑھنے سے اصل تصنیف میں جن شعرا کے اشعار مثال کے طور پر آئے ہیں ان میں سے بعض کے رتبے اور حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یکتا نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے کیسے اور کس

کے حکم سے یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ اندرونی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک مدت سے بطور خود تذکرۃ الشعرا مرتب کر رہا تھا۔ اس کا آغاز سنہ ۱۲۱۳ھ سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اور سنہ ۱۲۴۹ھ تک اس میں برابر ترمیمات اور اضافے ہوتے رہے، اسی کا ایک انتخاب بطور خاتمے کے دستور کے آخر میں ملحق ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کا اصل کتاب قواعد صرف ونحو اردو کی ابتدا اور انتہا سے کوئی تعلق نہیں اور یہ دونوں مستقل اور مختلف تصانیف ہیں۔

جس شاعر نے جس قدر اردو کی خدمت کی ہے اور اس کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے اسی تناسب سے ہمیں اس کے سوانح زندگی کی تلاش رہتی ہے۔ خدمت اردو کا درجہ اول ہے اور احوال زندگی کا ثانوی۔ ہم میر تقی میر کو اس لئے عزیز نہیں رکھتے کہ وہ خان آرزو کے بھانجے تھے یا خود آصف الدولہ نے انہیں لکھنؤ طلب کیا تھا یا وہ اپنے اور سودا کے سوا کسی کو پورا شاعر نہ مانتے تھے بلکہ ان کا کلام ان کے کمالاتِ شاعری کا شاہد عادل ہے اور اسی کے ضمن میں ہم ان کی زندگی کو قابل مطالعہ سمجھتے ہیں اور اپنے عزیز اوقات کو اس میں صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے ورنہ وہ خان آرزو کے بھانجے تو کیا نوح علیہ السلام کے بیٹے بھی ہوتے تو انہیں کون پوچھتا اور کون اس کی تحقیقات کرتا کہ دلی سے لکھنؤ جاتے وقت میر کے پاس ساری گاڑی کا کرایہ تک تھا یا نہیں۔ وہ لوگوں سے کم التفاتی و بے اعتنائی سے پیش آتے تھے یا لجاجت اور چاپلوسی سے اور وہ اپنی کمر میں پشتولئے کا ایک پورا تھان لپیٹ لیتے تھے یا رسی باندھ لیتے تھے اور اسی طرح انشا نے جو کچھ بھی اردو کی خدمت کی ہے۔ اگر وہ نہ کی ہوتی تو کون اس کی پروا کرتا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تالیف

"انشا" پر انشا کی جو تصویر بنی ہے اس میں سر پہ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ حال آنکہ "تکملۃ الشعراء" کے مولف نے جو انشا کا معاصر تھا لکھا ہے "بطور آزاداں یا صفائی چہار ابروی ماند" تو ان دونوں میں کون مستند ہے، یا یہ کہ انشا آخری وقت میں مجنون ہو گئے تھے یا مجذوب وعلی ہذا القیاس یہ سب ذیلی اور ضمنی باتیں ہیں۔ تحصیل زبان و ادب میں ان باتوں کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی گھٹاؤ یا بڑھاؤ نہیں ہوتا۔ آج دنیائے اردو میں افسانوں کی ہوا چل رہی ہے اور ہر ادیب ارادی یا غیر ارادی طور پر اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس لئے شعرا کی سوانح عمریاں پڑھنے میں جو لطف آتا ہے وہ ان کے کلام کی خصوصیات اور دوپران کے احسانات کے فنی مطالعے سے نہیں آتا۔

جرأت معاف۔ دستور الفصاحت کے دو حصے ہیں پہلا ایک سو ساسی صفحے کا نادر اور قیمتی تحقیقات کا خزانہ اور دوسرا اس خزانے کے بعض نادر روزگار طلائی سکوں کی تفصیلات کا صرف بتیس صفحوں کا خاتمہ۔ آپ نے دنیائے اردو کو خزانے سے محروم کر کے صرف اس کی تفصیلات کے خاتمے کو مزید نایاب کمیاب تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا۔ یکتا کی ہمیں ایک تصنیف مل گئی۔ اس کے حالات نہیں ملے خیر زبان و ادب کا کوئی معتد بہ نقصان نہیں ہوا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی یکتا کے صرف حالات ملتے اور تصنیف ملتی تو کس قدر نقصان اور افسوس ہوتا۔

آخر حواشی میں جو چوراسی صفحے چھپے ہیں ان میں چھوٹے ٹائپ میں اصل کتاب کے ۱۸۷ صفحے سما جاتے۔ یہ صفحے آپ نے جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے لکھے ہیں، اس محنت شاقہ کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے اس قسم کے

کام کئے ہیں، جزاکم اللہ خیر الجزا۔ یہ حصہ اس قابل تھا کہ تذکرہ تذاکیر الشعراء کے نام سے علحدہ شایع کیا جاتا۔ یہ ایک مستقل و ضخیم تالیف ہو سکتا ہے اور بہت ہی صبر شکن اور حوصلہ آزما کام ہے۔

دنیائے اردو شعرا کے حالات سے اگر کما حقہٗ نہیں تو تھوڑا بہت پہلے سے واقف تھی ہی، آپ نے اس معلومات میں اور اضافہ کیا۔ یہ بیشک آپ کا احسان ہے۔ لیکن احسانِ عظیم ہوتا اگر آپ اس نایاب جیسے کو جس سے دنیائے اردو مطلق واقف نہیں ہے شایع کر دیتے۔

دریائے لطافت اور قتیل — میں خواص کا ذکر نہیں کرتی متوسط بلکہ اس سے کچھ اونچے درجے کے ادبا میں کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے دریائے لطافت کا مکمل نسخہ دیکھا ہے اور اس کے دیباچے کو جس کا اقتباس میں نے اوپر لکھا ہے۔ بہ غور پڑھا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی شایع کردہ "دریائے لطافت" میں یہ اہم دیباچہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں آپ کے اس جملہ میں "ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے۔ جو مرزا قتیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ میں تمام ہوئی تھی"۔ مدد کے لفظ سے ہر اس عبارت کو پڑھنے والے کا دماغ قواعد اردو کی تدوین میں قتیل کی مدد کی طرف منتقل ہوگا۔ میری دانست میں اس عبارت میں یہ ترمیم ہونی چاہیے۔

"ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو سنہ ۱۲۲۲ھ میں تمام ہوئی تھی۔ اس میں منطق و عروض و قوافی

ومعانی وبیان پر جو ابواب ہیں، وہ مرزا قتیل نے لکھے ہیں۔"

"مدد یا شرکت" کا لفظ بہت ہی مغالطہ انگیز ہے، مثلاً "حضرت جوش نے مولانا حسرت کی مدد یا شرکت سے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شایع کیا ہے۔" تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر غزل کے انتخاب میں حضرت جوش اور ہر نظم کے انتخاب میں مولانا حسرت کی صلاح اور مشورے کو دخل ہے، حالانکہ کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ

"حضرت جوش نے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شایع کیا ہے جس میں غزلوں کا انتخاب مولانا حسرت نے کیا ہے۔"

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا "قواعد اردو کی کتاب موسومہ بہ دریائے لطافت کی تالیف میں قتیل شریک تھے یا وہ ان کی مدد سے لکھی گئی ہے" ذمہ دار تحریروں میں کوئی ایسے جملے جن میں ابہام ہو کیوں باقی رہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تذکروں میں جو سنہ آغاز و اتمام لکھا جاتا ہے، وہ محض برزخی کیفیت رکھتا ہے اور تذکرے کا حقیقی آغاز و اتمام اس سے بہت قبل اور بعد ہوتا ہے مثلاً مجمع النفائس کے اختتام کا سنہ ۱۱۶۴ھ لکھا گیا ہے حالانکہ اس کی تالیف کا زمانہ اندرونی شواہد کے مطابق ۱۱۵۲ھ سے ۱۱۶۷ھ کا ہے اور واقعی آپ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مجمع النفائس کے آغاز کے متعلق حزیں کے حالات سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی ترتیب ۱۱۵۴ھ سے پہلے ہونے لگی تھی اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مصنف (آرزو) نے دیباچے میں یہ بھی بتایا ہے کہ انہیں

اس کی ترتیب کا خیال کس طرح اور کب ہوا" اگر مصنف کی یہ عبارت بھی شائع ہو جاتی تو آپ کی تحقیق کی مزید تائید ہو جاتی ۔

کسی تذکرے کا آغاز و انجام معین کرنے کے لئے صرف دو امور اہم ہیں، ایک یہ کہ مولف نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو کب تذکرے کی صورت دینے کا ارادہ کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے اپنے تذکرے کو پہلے پہل کب قابل اشاعت سمجھا ۔

مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو طالب علمی کے زمانے سے اساتذہ فارسی کے منتخب اشعار ایک بیاض میں لکھنے لگے صرف اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ شدہ شدہ وہ ایک اچھا خاصا نادر اور انمول ذخیرہ بن گیا تو انہیں بطور خود یا دوستوں کے اصرار سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس علمی خزانے کی افادی حیثیت سے دوسروں کو کیوں محروم رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو منظم اور مرتب طور پر شائع کرنے کا قصد کر لیا۔ اور یہی زمانہ اس تذکرے کے آغاز کا ہے ممکن ہے کہ اس سنہ آغاز سے بیس سال پہلے اس بیاض کی ابتدا ہوئی ہو، لیکن وہ مدت معتبر نہیں، ورنہ یوں کہنا غلط ہوگا کہ بندہ ۱۹۲۲ء میں بی، اے کی جماعت میں داخل ہوا اور دو سال کا نصاب ختم کر کے سنہ ۱۹۲۴ء میں بی، اے پاس ہوا کیونکہ بی، اے کی جماعت میں داخلے کے لئے اکثر تیرہ سال پہلے سے تیاری کرنی پڑی تھی اور آج تک وہ ابتدائی مسائل کی تحقیق میں ہے جنھیں وہ دو سال کے عرصے میں تقابلی نقطہ نظر سے سمجھ تو چکا تھا لیکن حل نہ کر سکا تھا اور یوں کہنا حقیقت کے خلاف ہوگا کہ وہ سنہ ۱۹۲۹ء سے بی، اے کی جماعت میں داخل رہا تھا اور امتحان پاس ہو جانے کے بعد بی، اے کے درجے کی جو معیاری لیاقت ہے وہ جامع اور اتنی ٹھوس پیدا کی

حاصل ہو چکی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خوش نصیب سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بی، اے پاس کر لیتا ہے، محض اس لئے کہ قدرت نے اسباب فراہم کئے تھے۔ اور وہ امتحانات پاس ہوتا ہی چلا گیا اور کوئی ذہن کا پکا بڑی عمر میں بی، اے ہونے ہی کے قصد سے ابتدائی مراحل طے کرتا ہے، اگرچہ یہ تمثیل بیش پا افتادہ ہے لیکن میرا مفہوم اور تذکروں کے مولفین کا حال اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

آرزو دیباچے میں لکھتے ہیں کہ مجھے فلاں سنہ میں (؟) تذکرے کی ابتدا کا خیال پیدا ہوا تو وہی اس کے آغاز کا سنہ ہے۔ خواہ اس سے پہلے کے کسی سنہ کے کسی واقعے کا ذکر مولف نے بصیغۂ حال کیا ہو، لیکن مولف اگر آغاز کا صراحتاً یا کنایتہً ذکر نہ کرے تو تذکرے میں جن مختلف زمانوں کا حال ملتا ہے، ان میں سب سے مقدم زمانے کو آغاز کا زمانہ قرار دینے کے لئے یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس مولف کے سوانح حیات سے بخوبی واقف ہوں کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا، تعلیم و تربیت کہاں پائی۔ اس کے طبعی رجحانات اور مشاغل زندگی کیا تھے۔ تلاش معاش میں کہاں کہاں کا سفر کرنا پڑا۔ تصنیف تالیف کے لئے جس آسودگی اور سکون کی ضرورت ہے وہ اس کو عمر کے کن زمانوں میں میسر ہوئی، اس تذکرے کی تالیف کے محرکات کیا تھے وغیرہ

اب رہی تاریخ اختتام وہ بلاشبہ وہی رہے گی جو مولف نے لکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی روا نہیں۔ پہلے زمانے میں طباعت کی سہولتیں نہ تھیں ۔۔۔ تذکرہ ختم ہو جانے کے بعد بھی مولف ہی کے پاس دھرا رہتا تھا اور صرف خاص

خاص لوگوں کی نظروں سے گزرتا تھا۔ ایک آدھ شایق کو اس کی نقل لینے کی اجازت ملتی بھی تھی تو وہ نقل اصل تذکرے کی ضخامت کے لحاظ سے ہفتوں اور مہینوں میں پوری ہوتی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ ہر تالیف میں کچھ کمیاں رہ گئی ہوں، یا بعض مقام تفصیل یا اختصار چاہتے ہوں مولف انہیں وقتاً فوقتاً درست کرتا رہتا تھا۔ یہ گویا تذکرے کے کئی ایڈیشن ہیں مثلاً آب حیات کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں نکلا اس میں میر ضاحک اور مومن کے حالات نہیں تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ بڑھائے گئے تو یہ کہنا کہ ۱۸۸۰ء میں یہ تذکرہ ختم نہیں ہوا تھا اور اس کا سال اختتام اس سنہ کے بہت بعد ہے حقیقت نہیں۔

دستور الفصاحت کی آئندہ اشاعتوں میں آپ ترمیمات اور اضافے کرتے ہی جائیں گے لیکن اس کا سال اختتام یعنی اشاعت اول کا سنہ وہی ۱۹۴۳ء رہے گا اور حق یہ ہے کہ کوئی مولف یا مصنف اپنی تالیف یا تصنیف ختم کر لینے کے بعد اس میں جو عبارتیں گھٹاتا اور بڑھاتا ہے وہ اس کی انصاف پسندی اور اصابت رائے کی کسوٹی ہوتی ہیں اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی مولف اپنے ماضی اور اپنے زمانے سے کس قدر گہری یا سطحی واقفیت رکھتا ہے اور اگر ہم کسی تذکرے کے اختتام کا سنہ اس میں کے آخری اضافے کے سنہ کو مان لیں تو نفسیات انسانی کا ایک اہم باب حذف ہو جائے گا کہ وہ کس طرح اپنی سعی کو کسی خاص درجے پر پہنچ کر مکمل تصور کر لیتا ہے اور امتداد زمانہ اس فیصلے کو نظر ثانی کا محتاج ثابت کر دیتا ہے۔

گزشتہ زمانے میں تذکروں کی اس نہایت ہی محدود اشاعت سے

ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ مولف جس کے بارے میں جو جی چاہتا تھا، لکھتا تھا، اور کوئی معارض نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پورا زمانہ گزر جاتا تھا، متاخرین کو اگر مولف اور اس کی تحریروں کے متعلق کافی ذخیرہ معاصرین کا لکھا ہوا مل جاتا ہے تو آسانی ہو جاتی ہے ورنہ وہ وثوق کے ساتھ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ایک اور شکل یہ ہے کہ جب تک مولف کی شخصیت ایسی نہ ہو کہ اس کے قلم سے نکلا ہوا لفظ لفظ سند بن جانے کا امکان رکھتا ہو تو معاصرین اس سے تعرض بھی نہیں کرتے اور اگر کریں بھی تو جب تک خود معترض یا اس کے معاصر ان اعتراضات کو قلم بند نہ کریں وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کسی ایسے تذکرے میں جس کا معاصرین نے ذکر نہیں کیا اور جس کو مولف اور اس کے کراماً کاتبین کے سوا کوئی چوتھا نہیں جانتا تھا کسی مانی ہوئی بات کے خلاف کوئی امر لکھا ہو تو ایک سو سال کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ امر واقعہ نہ ہوتا تو اسی زمانے میں لوگ اس دروغ بیانی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتے۔

عوام میں مشہور ہے کہ لوگ خود مشہور ہو جانے کے لئے کسی مستند شخص پر تنقید کر دیتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ حقیقی شہرت کا سودا اگر اس قدر سستا بک سکتا ہے تو اس میں زبان اور ادب کا کوئی نقصان نہیں، سراسر نقصان تو اس امر میں ہے کہ کوئی غلط بات ایک مستند شخص کے قلم اور زبان سے نکل کر صحیح مشہور ہو جائے لیکن تاریخ زبان اور ادب گواہ ہے کہ ہر دور میں بعض مشاہیر کی شخصیتیں اس قدر "تنقید سہار" ہوتی ہیں کہ ان کے معاصرین کی معقول سے معقول تنقید بھی ان کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتی اور وہ آئندہ نسلوں پر اس کا فیصلہ

چھوڑ جاتے ہیں کہ مملکت علم میں یہ "اٹل پن" بغاوت تھا یا خروج۔

آیئے ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے دو جگہ اختلاف کیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر یہ قیاس کرتا ہے کہ نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسے تسلیم فرما لیا ہے (دیباچہ صفحہ ۴۳)

(۲) صاحب گلزار کی تاریخ وفات ڈاکٹر اسپرنگر اور بلوم ہارٹ نے سنہ ۱۲۰۸ھ بتائی ہے، مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے بھی گلشن ہند کے مقدمے میں اسی سنہ کو دہرایا ہے۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو الخ (دیباچہ صفحہ ۸۷)

"تسلیم فرما لیا ہے" اور "دہرایا ہے" کے معنی یہ ہوئے کہ انہیں اسپرنگر کے ان فیصلوں کو تسلیم نہ فرمانا اور نہ دہرانا چاہیئے تھا لیکن نکات الشعرا کے متعلق آپ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "میر صاحب نے یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۱ھ میں یا اس کے کچھ بعد لکھنا شروع کیا اور شعبان ۱۱۶۵ھ کے قبل ختم کیا" ص۴۶

تو مولوی صاحب پر صرف اتنا اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھوں نے "سنہ اختتام" کی بجائے "سنہ تالیف" کا لفظ استعمال کیا جو سنہ آغاز و انجام دونو پر حاوی ہے اس لئے دھوکا ہوتا ہے کہ میر نے اسی سنہ میں تذکرہ شروع کر کے اسی سنہ میں اس کو ختم کر دیا تھا لیکن مولوی صاحب نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ کسی کتاب پر پیر رائے دے چکنے یا اس کتاب پر کسی کی رائے کی تصدیق کر چکنے کے بعد تحقیق کا دروازہ بند ہے اور کسی کو مزید تحقیق کا مجاز نہیں۔

ہم مولوی صاحب سے غلطیوں کا وقوع محال کیوں فرض کر لیں جو ہم کو ان کی کسی غلطی پر تعجب ہو۔ جیسا آج اردو کا ہر محقق آزاد کی آب حیات پر

کوئی اعتراض ضروری سمجھتا ہے، اسی طرح مولوی صاحب پر کوئی ایراد ضرور کرتا ہے۔ انھوں نے "تاریخ ادب اردو" میں بے شمار صحیح معلومات کا انکشاف کیا ہے، کہیں کہیں غلطیاں بھی ان سے ہوئی ہیں، لیکن انہیں بطریق احسن رفع کرنا ہمارا فرض ہے میرا مطلب ہے کہ آپ اپنی تحقیق پیش کرنے سے پہلے اگر صرف اسی قدر لکھتے تو کافی تھا کہ " ڈاکٹر اسپرنگر اور مولوی عبدالحق صاحب یہ قیاس کرتے ہیں کہ نکات الشعراء کا سنہ تالیف ۱۲۲۵ھ ہے اور صاحب گلزار کی وفات اسپرنگر اور بلوم ہارٹ اور مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۲۰۸ھ بتائی ہے۔

مولوی صاحب پر جو دوسرا اعتراض ہے اس میں صاحب گلزار کی تاریخ وفات ۱۲۰۸ھ کے صحیح نہ ہونے میں آپ کو جو شبہے ہیں ان کے وجوہ نہیں لکھے گئے، حالاں کہ آپ صاحب گلشن ہند کی سند پر صاحب گلزار کو ۱۲۱۵ھ سے پہلے متوفی مانتے ہیں۔

دیباچہ صفحہ ۴۴ :- آپ لکھتے ہیں" میر صاحب نے صرف ایک شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۱۶۱ھ کے کسی مشاعرے کی طرح میں لکھی گئی تھی۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی کہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنتے جو دلی کے مشاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں" اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی غالب کے حال اور نمونہ کلام میں ان کا صرف یہ ایک شعر

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا۔

لکھے تو اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مولف نے ۱۸۵۵ء یعنی ذوق کی وفات سے پہلے غالب کا حال لکھا ہے کیونکہ بقول آزاد (آب حیات ص۱۱۵) ذوق نے اس شعر کی تعریف کی تھی۔ ہماری نظر میں حاتم خود بہت بڑے شاعر اور ایک صوفی صدی شاعر کے استاد ہیں اور ان کی استادی کا حق اسی وقت ادا ہوتا کہ میر صاحب کم از کم پچیس شعر ان کے انتخاب کرتے لیکن اس کی کیا تدبیر کہ خدائے سخن حاتم کو "مرد جاہل و متمکن" سمجھتا تھا۔ یہ ایک شعر بھی ان کی طبع نازک پر گراں ہے۔

گلشن سخن، کی تالیف کا زمانہ آپ نے یوں معین کیا ہے:" دیباچے میں مصنف نے "آج پھولا ہے سخن کا گلشن" مادۂ تاریخ لکھا ہے جس سے ۱۱۹۴ھ برآمد ہوتے ہیں، چونکہ کتاب میں بھی جا بجا یہی سنہ 'اکنوں' یا 'الحال' کے ساتھ مذکور ہے اور مصنف کا دعویٰ بھی ہے کہ کتاب تھوڑے عرصے میں تصنیف ہوگئی تھی، اس لئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ایک سال کے اندر کار تالیف سے مبتلا فارغ ہو گیا تھا۔"

لیکن خاتمے کے صفحہ ستر کے حاشیے میں آپ لکھتے ہیں" مبتلا در گلشن سخن (۴۳ ب) می گوید" شیخ محمد حاتم موطنش دہلی و معاصر نجم الدین، آبرو بودہ، زبانش با زبان ولی دکنی مناسبت دارد، میر عبدالحی تاباں از تلامذۂ اوست، شاعر فصیح بیان و سرآمد ریختہ گویاں (بود) دیوانش دو ہزار بیت بلکہ زیادہ" تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ آبرو کا انتقال ۱۱۶۱ھ مطابق سنہ ۱۷۵۰ء میں ہوا اور تاباں کے انتقال کی تاریخ آپ نے سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق سنہ ۱۷۴۷ء لکھی ہے (خاتمہ ص۶۱) حالاں کہ سنہ ۱۱۶۱ھ کا مطابق سنہ عیسوی سنہ ۱۷۴۷ ہے اور حاتم کا انتقال ۱۱۹۷ھ میں ہوا، یعنی گلشن ہند کے اختتام کے تین سال بعد اس لئے سرآمد ریختہ گویاں

کے بعد بریکیٹ میں (است) چاہیے نہ کہ (بود) ورنہ آپ کے اصول کے مطابق ماننا پڑیگا کہ تذکرے کا انجام ۱۱۹۵ھ کے بعد ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۶۴:- نواب صدر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں۔

"تذکرۂ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی رموز العارفین ہے۔ گلزار ارم نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ ہے۔

رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔"

تذکرے کا آغاز ۱۱۸۸ھ کے بہت بعد کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی تالیف کے زمانے میں رموز العارفین مشہور ہو چکی تھی اور اس مثنوی کو کسی پہلے کے کارنامے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں سے مشہور ہونا تھا۔ سحر البیان تو گیارہ سال بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۸۸ھ سے پہلے بھی اس کا آغاز ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ جب ۱۱۸۸ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی اور مشہور ہو چکی تو اس کا نام بھی پہلے سے لکھے جانے والے تذکرے میں درج کر دیا گیا۔ لیکن ۱۱۹۲ھ کی تالیف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں گلزار ارم نہیں ہے یعنی یہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اب نواب صاحب موصوف کی تحقیق کے متعلق آپ فرماتے ہیں،

کہ خود میر حسن نے خاتمۂ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "در تاریخ ۱۱۹۰ھ باتمام رسید" اور اس تذکرے کے آغاز و انجام کے متعلق دیباچے کے چھ صفحوں کا خلاصہ یہ ہے کہ "میر حسن نے ۱۱۸۴ھ یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ میں ختم کر دیا

تھا اور بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں
واقع ہوئی ہے۔ لیکن تاریخ انجام کے بارے میں آپ نے نواب صاحب کے صحیح تخمینے اور
درست قیاس کی داد نہیں دی جو ضروری تھی۔

دیباچہ صفحہ ۹۰ :۔ مخزن الغرائب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں "دیباچے
سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۸ھ میں مصنف کو اس کی ترتیب تالیف سے فراغت
ہوتی ہے" چند سطروں کے بعد لکھا ہے :۔

"کتاب خانہ عالیہ رامپور میں اس کی جلد اول کے دو نسخے ہیں مگر
دونوں ناتمام ہیں اس بنا پر اس کے آغاز و انجام وغیرہ کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے"
اس عبارت سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ (۱) مذکور نسخے جلد اول ہونے
کے لحاظ سے ناتمام ہیں (۲) یا ان کے دیباچوں کے صرف اسی قدر حصے باقی رہ گئے
ہیں جن سے تاریخ انجام مفہوم ہوتی ہے۔

آخر میں آپ لکھتے ہیں :۔ "مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانے
میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے" جب یہ بات ہے تو جو کتاب جب ایسے بندگان عالی پیں
اعلیٰ حضرت فرماں روائے رامپور دام اقبالہم و ملکہم تصحیح و تحشیے کے ساتھ شائع ہوئی
ہے اور یادگار عقد سعید نکاح حضور شہزادۂ آفاق نواب ولیعہد بہادر ہے اس کی
تکمیل کے لئے ناممکن تھا کہ نواب صاحب موصوف اپنا نسخہ مستعار دینے میں دریغ فرماتے
یا آپ خود حبیب گنج پہنچ کر اس کو دیکھ آتے۔ جو کتاب ہمارے ملک میں ہے اور جس کے
آغاز و انجام کے متعلق ہم خود قطعی فیصلوں پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے آغاز و انجام کے
بارے میں ڈاکٹر اسپرنگر اور ڈاکٹر ایتھے کے مشتبہ اقوال کیوں نقل کئے جائیں مذکورہ

بالا جملے سے آپ کا مفہوم کچھ ہو، لیکن قارئین بلا وجہ نواب صدر یار جنگ بہادر پر افسوس کریں گے اور دلیل یہ ہوگی کہ نواب صاحب موصوف مذکور تذکرہ کسی کو بتانے تک کے روادار نہیں ورنہ محال تھا کہ ریاست رامپور ایک شخص کے سفر اور حبیب گنج میں چند ہفتوں کے قیام کے اخراجات برداشت نہ کرتی۔ اس لئے یا تو یہ آخری جملہ حذف ہو جانا چاہیئے یا مکمل نسخہ دیکھنے کے بعد ہی اس کے متعلق رائے لکھی جائے، پروفیسر نکلسن نے مثنوی مولانا بلخی کا ایک قدیم نسخہ مثنوی کی تصحیح کے لئے مستعار طور پر کتاب خانۂ عالیہ رامپور سے حاصل کیا تھا۔

دیباچہ صفحہ ۶۹:۔ تذکرۂ ہندی قلمی کی عبارت یہ ہے: "از نجباے امروہہ مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست متصل" لیکن خاتمے کے صفحہ ۹۳ میں مولوی عبدالقادر صاحب رامپوری خود مصحفی کی زبانی فرماتے ہیں۔ "می گفت کہ مولد من بلم گڈھ است کہ متصل شاہجہاں آباد است" ان میں سے کس کا قول مرجح ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۰۴:۔ (مولوی عبدالغفور خاں نساخ سخن شعرا میں) داغ کا تذکرہ حالیہ صیغوں میں کرکے تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲۸۵ھ میں ان کا انتقال ہو گیا یہ کون داغ ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ (استاد اعلیٰحضرت اقدس میر محبوب علی خاں) کا انتقال ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۸۴:۔ انجمن ترقی اردو نے لسے (عقد ثریا از مصحفی) شایع کر دیا ہے۔ مگر کوئی سطر غلطی سے پاک نہیں۔ انجمن نے جو بعض نایاب قلمی کتابیں شایع کی ہیں ان میں یہ نقص موجود ہے خصوصاً دریاے لطافت کا جو فارسی نسخہ شایع کیا ہے وہ دریاے لطافت مطبوعہ مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد کا چربہ اور

مختصر ایڈیشن ہے۔ میں نے اپنی تالیف "انشا" کے سلسلے میں ان دونوں کا مقابلہ کیا تو انجمن کے نسخے میں بیسیوں مقام غلط نکلے اور اس غلط فارسی نسخے کا مخدومی علامہ کیفی نے جو ترجمہ اردو میں کیا ہے، اس پر آپ کا جملہ صادق آتا ہے اس لئے کتاب کے اہم مطالب خبط ہو گئے ہیں، مثلاً صرف اردو ترجمے کی مدد سے آپ "دروازۂ اول در بیان کیفیت زبان اردو و حروف تہجی اردو" سے "حروفے کہ دریں زبان بہ تلفظ درمی آید ہشتاد و پنج حروف است" کے مطابق ۸۵ اور ۹۵ حروف شمار کرنے کی سعی کیجیے گا۔ آپ یقیناً پریشان اور ناکام ہوں گے اور اسی سے میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔ ترجمہ مذکور ہندوستان بھر کے اعلیٰ نصابوں میں داخل ہے اور طلبہ قواعد کی ایک ایسی کتاب جو انشا نے لکھی تھی، مگر اب اس کے مطالب وہ نہیں رہے، جو انشا نے بیان کئے تھے، تبرکاً وتیمناً پڑھے جا رہے ہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جن کتابوں کی تفصیل لکھی ہے، وہ اگر نادر اور کمیاب قلمی کتابوں ہی تک محدود ہوتی تو دیباچے کا وقار قائم رہتا، آپ نے چند ایسی کتابوں کا تعارف کرانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے جو چھپ چکی ہیں اور ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں، ان کا صرف حوالہ دے دیا جاتا تو کافی تھا۔ موجودہ صورت میں یہ دیباچہ "تاریخ ادب و زبانِ اردو" یا کسی کتاب خانہ کی فہرست کتب معلوم ہوتا ہے۔

خاتمے کے حاشیوں میں جو نوٹ لکھے گئے ہیں تعریف سے مستغنی ہیں، اس کی افادی حیثیت عدیم النظیر ہے۔ میری نظر سے تاریخ ادب یا زبان اردو کی ایک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں اس قدر سیر حاصل اور جامع حواشی مہیا کئے گئے ہوں۔ البتہ یہ کہ سرور کے مطلع الشعرا کا جو اقتباس آپ نے خاتمہ طبع پر دیا ہے، اس میں نواب سعادت علی خاں بہادر ... کے بعد کی عبارت نقل کر کے رد فرما

حضرت کیفی اور دریائے لطافت کا ترجمہ

انشا کی معرکۃ آرا اور عدیم النظیر تصنیف "دریائے لطافت" ہے اور انجمن ترقی اردو دہلی کے سے ذمہ دار ادارے نے حضرت کیفی جیسے مشہور و معروف ادیب سے اس کا اردو ترجمہ کرا کے شائع کیا ہے۔ میں نے انشا کے متعلق اپنا مطالعہ اسی ترجمے سے شروع کیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے مطالعہ بڑھتا گیا، انشا کی لسانی قابلیت اور قواعد دانی اور اصابت رائے پر میرے شبہات بڑھتے گئے اور مخدومی مولوی عبدالحق صاحب کی اس عبارت سے یہ شبہات اور قوی ہو گئے۔

"پہلی بار میں نے زبان وہی رکھی تھی جو انشا کی تھی۔ طبع ثانی میں اس خیال سے کہ شاید فہم مطالب میں حارج ہوتی ہو فارسی سے اردو کر دی۔" (دریائے لطافت طبع ثانی صفحہ ۔)

میں نے خیال کیا کہ فہم مطالب میں شرح و حواشی کے ذریعے آسانیاں بہم پہنچانے کے بعد بھی اگر دریائے لطافت کے سمجھنے میں یہ دشواریاں ہیں تو انجمن کے مطبوعہ فارسی نسخے کا کیا حال ہوگا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میں نے اردو ترجمے کا اصل فارسی سے مقابلہ کیا۔ دریائے لطافت کے افہام و تفہیم میں اس ترجمے سے صدہا مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں اور اگر انجمن ترقی اردو کا مطبوعہ فارسی نسخہ ناپید ہو جائے تو یقیناً انشا کی بہت غلط مسخ ہو جائے گی۔ لیکن اس میں بھی دو ایک مقام مبہم ہیں اور کتابت کی غلطیاں تو بیسیوں

ہیں۔ میں مخدومی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس کی علم نوازی کی ممنون ہوں کہ انھوں نے دریائے لطافت کا وہ نسخہ جو مطبع آفتاب عالم تاب شدآباد میں چھپا تھا، مجھے استفادے کے لئے عنایت فرمایا۔

ترجمے کی کل لغزشوں کا انحصار لاحاصل ہے، بہت سی فاش غلطیاں اس لئے پیش کر دی ہیں کہ دریائے لطافت کے اردو ترجمے کو پڑھ کر کوئی "اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنے والا" یہ دعوٰی نہ کرے کہ وہ انشا کی تحقیقات سے مستفید ہو رہا ہے۔

میں نے یہ مضمون سنہ ۴۴ء میں اشاعت کے لئے ایڈیٹر ہمایوں لاہور کو بھیجا تھا۔ انھوں نے اس کو حضرت کیفی کو بھیج دیا۔ دو برس بعد میں نے حضرت کیفی کی خدمت میں مرقوم الذیل خط بھیجا۔

مخدومی۔ تسلیم ۱۵ اپریل سنہ ۴۶ء

مورخہ ۲۸ جنوری سنہ ۴۴ء کے عنایت نامے میں آپ نے میسور تحریر فرمایا تھا کہ "میں مارچ تک بہت مصروف ہوں۔ کام کی معمولی گھکیڑ تو رہتی ہی ہے، بہر صورت جلد سے جلد آپ کے مضمون دیکھنے کا وقت نکالوں گا"، لیکن اس پر تقریباً دو سال گزر گئے۔ "ہماری زبان" کے ذریعے اس مدت میں آپ کی طویل علالت کی کیفیت بھی معلوم ہوئی جس کی وجہ سے آپ اردو کی بہت سی اہم اور ناگزیر خدمتیں انجام نہ دے سکے، اردو پر آپ کے احسانات عظیم ہیں۔ خداوند متعال آپ کو صحت اور عزم کامل اور اردو کی خدمت کے وافر ذرائع عنایت فرمائے۔

"دریائے لطافت" ہندوستان بھر کے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی نصابوں

میں داخل ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ انشاؔ کی تصنیف ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ انجمن ترقی اردو نے اس کو شایع کیا ہے۔ اور آپ جیسے کثیر المشاغل دنیائے اردو کے زعیم اور مشرقی و مغربی ادبوں کے ماہر نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور آپ کی اور انجمن کی ساکھ دنیائے اردو میں اس حد تک قائم ہے کہ محض آپ کی اور انجمن کی ضمانت پر گیارہ سال کے عرصے میں ترجمہ دریائے لطافت کے کسی پڑھنے یا پڑھانے والے نے اس کو اصل کے ساتھ مطابق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور مترجم کی لغزشوں کو انشاؔ کی تحقیقات یقین کر کے انھیں یاد کرتے چلے گئے۔ بہت ممکن ہے کہ بہتوں نے ان لغزشوں کو جانچا اور پرکھا ہو لیکن انہیں آپ تک یا اس ترجمے سے استفادہ کرنے والوں تک پہنچانے کی جرأت نہ کی ہو یا اس امر میں تجاہل و تساہل کیا ہو۔ یا ممکن ہے کہ اس دوسری قسم کے لوگوں کی سعی کا وہی انجام ہوا ہو جو میری کوشش کا ہوا۔ اس لحاظ سے دریائے لطافت کے اس ترجمے نے انشاؔ کی ادبی کاوشوں کو جو نقصان پہنچایا ہے، اس کا صحیح اندازہ آپ جیسا محسنِ اردو ہی کر سکتا ہے۔ میں نے ترجمے کی جو چند نہایت نمایاں اور موٹی موٹی غلطیاں اپنے مضمون "حضرت کیفی اور دریائے لطافت کا ترجمہ" میں بتائی تھیں ان کی اشاعت "ہماری زبان" یا رسالہ "اردو" میں بلکہ ہندستان کے متعدد اور کثیر الاشاعت ادبی رسالوں میں ضروری تھی تاکہ جن جن کے پاس یہ ترجمہ ہے ان سب تک یہ غلطیاں پہنچ جائیں اور انشاؔ کی طرف غلط چیزیں منسوب ہو جائیں۔

انسان آخر انسان ہیں۔ غلطیاں آپ سے ضرور سرزد ہوں گی۔ اس میں غیر فطری کوئی امر نہیں۔ لیکن جب ان کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے اور پھر سو پچاس تک نہیں بلکہ کروڑوں کے حق میں یہ مضر ثابت ہو رہی ہیں تو اب تک ان کا تدارک ہو جانا چاہیے تھا شخصی حیثیت یا ذاتی وقار مفاد اردو کے پیش نظر کوئی چیز نہیں۔

خدا گواہ ہے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں ادبی یا "صحافتی" دنیا میں آپ کے معترض کی حیثیت سے کوئی مقام حاصل کروں، آپ کا یہ جملہ میرا ایمان ہے "رسالوں میں مناظرہ برپا کرنا نہ آپ کو پسند ہوگا نہ مجھے پسند ہے" میں احسان فراموش بھی نہیں، آپ کی عنایتیں مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں۔ لیکن جب دیکھتی ہوں کہ آپ کی شخصیت کی وجہ سے اردو کا نقصان ہو رہا ہے تو میری خاموشی دنیائے اردو کا ناقابل عفو جرم بن رہی ہے۔

للہ مجھے اس ذہنی کوفت سے نجات دلوایئے اور جلد از جلد میرے حوالے کے بغیر خود اپنی جانب سے اردو کے طالب علموں کو ترجمے کے اسقام سے مطلع کر کے انھیں رواج پا جانے سے روکئے۔

فقط

خاکسار

آمنہ خاتون

اب پورے پانچ سال بعد میں نے خود اس کو شایع کر دیا ہے۔

(انشا سے مراد دریائے لطافت کا فارسی نسخہ اور کیفی سے مراد اس کا اردو ترجمہ ہے۔

انشا "و لیکن فصیحاں یہاںؔ را یہاں بروزن جہاں و یہاں بروزن نہاں

سلہ فارسی نسخے میں یہاں بتقدیم ہا بریا لکھا ہے اور صفحہ ۹۲ پر ایک گنجی کی زبان سے جو سنا ئیں ص ۴۲ میں چکا تھا وہاں کی بجائے ہواں بتقدیم ہا برا واو آیا ہے۔ لیکن حروف مخلوط کی جو لسٹ انشا نے گنائی ہے ان میں "ی" مخلوط با "ہ" اور "واو" مخلوط بہ "ہ" داخل نہیں اور ان حروف کا کہیں کہیں گفتگو یا کتابت میں داخل ہو جانا ان کے

(بقیہ ص ۱۳۵)

بہ تلفظ درآرند وہا را دریا غائبؔ کنند، ص۲ سطر ۱۸ - ۱۷

کیفیؔ "بعض 'یہاں' بروزن جہاں کو 'ماں' کے وزن پر بولتے ہیں۔

اور 'ہ' کو الف کے ساتھ مخلوط کر دیتے ہیں [یہاں، وھاں، یا یاں، واں] ص۲"

انشاؔ: وھاں کبھی آنجا بروزن ماں و علیٰ ہٰذا القیاس یہاں یہاں وزن

کبھی ایں جا"۔ ص۸

کیفیؔ: "واو اور ی کے اختلاط کی مثال ہے یہاں اور وھاں" اور حاشیے

میں نوٹ لکھا ہے کہ "یہاں اور وھاں کا جلد ہی یاں اور واں بروزن جاں بن گیا تھا۔

یہاں اور وھاں کے یہ مخفف اب متروک سمجھے جاتے ہیں" ص۱۳۰

انشاؔ نے پورب میں اردو بولنے والے مسلمانوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

(۱) کسانیکہ پدر و مادر شاں در شاہجہان آباد بشہر دیگر رسیدہ اند و صاحب ولادت ہما جا شدہ اند

روزمرۂ آنہا بعینہٖ روزمرۂ دارالخلافہ است۔

(۲) اہل دہ کہ از فیض ہم نشینی شاہجہان آبادیان سلیقۂ خورش و پوشش و فصاحت بیان

و تیزیٔ زبان حاصل نمودہ بینندگاں را در غلط انداختند۔

(بقیہ ص۱۳۴) صحیح ہونے کی دلیل نہیں۔ اس لئے میں نے انھیں غیر فصیح قرار دیا ہے۔ اور ان کی بجائے

بقول انشاؔ ان کی فصیح شکلیں یہاں اور وھاں لکھدی ہیں۔

؎۲ انشاؔ کے اسلوب بیان سے واضح ہے کہ جہاں وہ کسی حرف کے کسی حرف کے ساتھ مخلوط ہونے کا ذکر کرے گا تو

تیکے شدہ یا گشتہ یا ہست یا متحد شد کہے گا۔ اور اگر کوئی بولنے میں حرف مخلوط کی آواز کو پوری طرح حذف ہی کر دے اور

تلفظ میں اس کا اشمام تک نہ ہو تو کہے گا کہ "غائب کنند"

؎۳ "ہ" کو الف کے ساتھ مخلوط کر دیتے ہیں" بے معنی ہے۔ ہ الف کے ساتھ مخلوط نہیں ہوتا بلکہ ہ کی آواز کو ی کی آواز میں غائب کر دیتے ہیں۔

(۳) بعضے صاحباں (شاہجہاں آبادیاں و اولادشاں) از کثرت صحبت سکنان آں شہر (پورب) چند لفظ مخالف اردو نیز استعمال کنند (یہی وہ لوگ ہیں جن کو انشا "بعضے فصیحاں" کہتا ہے۔)

دو بار ان فصیحوں کا ذکر آیا ہے۔

(۱) بعضے فصیحاں یہاں را۔ الخ

(۲) در شاہجہاں آباد جائیکہ "تو یار چلو چاندنی چوک تک ہو آئیں"۔ "گویند در پورب" "تے یار چلو چاندنی چوک کی سیر کریں" محاورۂ بعضے فصیحاں باشد۔

انشا کی عبارت کا مطلب صاف ہے کہ پورب میں تیسری قسم کے لوگ یہاں (ہ مخلوط بہ ی) کو یہاں بروزن جہاں اور یاں بروزن ناں کہتے ہیں۔ یہ "تلفظ شاہجہاں آبادی نہیں۔ پوربی ہیں۔ لیکن فصیحوں کی زبان پر بھی" از کثرت صحبت ساکنان آں شہر" جاری ہیں۔

کیفی کے ترجمے کا یہ مطلب ہوا کہ شاہجہاں پور میں یہاں صرف بروزن جہاں بولا جاتا ہے اور اہل پورب میں سے بعض یعنے کمتر بروزن ناں اور باقی کے یعنے بیشتر بروزن جہاں بولتے ہیں، حاصل یہ کہ یہاں اردو کا تلفظ ہی نہیں۔

کیفی نے سیاق وسباق کی رعایت کئے بغیر لفظ فصیحاں کو حذف اور عبارت کو مسخ کر کے ترجمہ کر دیا ہے۔ پوربی اردو میں بہت سے لفظ مخالف اردو داخل ہیں۔ اور ہونے بھی چاہئیں۔ یہ لفظ سب کے سب فصیحوں کی زبان پر نہیں۔ زیادہ میل جول سے چند لفظ ایسے استعمال ہونے لگے ہیں اور یہاں اس قسم کے لفظ آئے ہیں۔ انشا نے تصریح کر دی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۵) لہ اگر یہ نہ لکھا دیا آ گیا، اور واں بروزن جاں ہے تو کیا ان الفاظ کا کوئی اور تلفظ ممکن ہو سکتا ہے

ان دو جملوں میں کہ یہاں اور وہاں بروزن ناں ہے اور یاں و واں بروزن جاں ہے پہلا ضروری اور دوسرا غیر ضروری ہے

ہے کہ یہ لفظ فصیحوں کی زبان پر بھی ہیں۔ کیفی کی عبارت ان امتیازات کو واضح کرنے سے قاصر ہے۔

انشا۔ "دیگر دھنی بجائے کڑی یعنی چوب سقف دیگر۔ نرکل بجائے نرسل دیگر دہنا۔ بمعنے دست راست بجائے دانیاں یا داہنا۔ دیگر ہتوری بجائے رسولی۔ دیگر داد ھیال و نانھیال بز یادت الف" ص۳

انشا نے لکھا ہے کہ دانیاں یا داہنا اردو ہے اور دہنا پوربی۔ کیفی نے لکھا ہے کہ دھنا اردو ہے اور دانیاں یا داہنا پوربی۔ یہ انشا کا ترجمہ ہوا یا اس کی مخالفت

انشا۔ "کاہیکو بمعنی چرا۔ کاہے دراصل زبان برج است۔ "کاہے رے بھیا"۔ یعنی چرا اے برادر۔ لفظ کو با کاف و واؤ مجہول چوں لحق آں کردند۔ روز مرۂ اردو شد" ص۱۴

کیفی۔ "کاہیکو جس کے معنے ہیں کیوں، کس واسطے، یہ برج کی بولی ہے اردو میں کو کی ایزادی سے تصرف کیا گیا۔ اب اردو ہو گیا۔ برج والے کہتے ہیں۔ کاہے رے بھیا" ص۷

کیفی کے ترجمے کا تجزیہ یوں ہوگا۔

(۱) کاہیکو جس کے معنی ہیں کیوں۔ کس واسطے "یہ برج کی بولی ہے"۔
حال آں کہ کاہیکو اردو ہے اور صرف کاہے برج کی بولی ہے۔

(۲) "اردو میں کو کی ایزادی سے تصرف کیا گیا" اب اردو ہو گیا"
اس کے یہ معنے ہوئے کہ کاہیکو پر ایک اور کو بڑھایا گیا یعنے "کاہیکو کو" یہ اب اردو ہو گیا۔

(۳) برج والے کہتے ہیں "کاہے رے بھیا"
جب کاہیکو برج کی بولی تھی تو یہاں کو کیوں اڑ گیا۔

انشا۔ "ہرگاہ اہل دہلی شاہجہاں پور را از زبان بر می آرند۔ اظہار واو در پور می کنند پور بر وزن خور کہ بمعنی آفتاب است میگویند و پوربیاں پور بر وزن نور ادا نمایند۔ ہمچنین مہاں رکہ قصبہ ایست متصل لکھنؤ بر وزن گماں۔ وہاں بروزن طوفاں گویند" صہ۲

کیفی۔ "اہل دہلی شاہجہاں پور بولتے ہوئے پور کو خور (آفتاب) کے وزن پر ادا کرے گا پورب والا اسے نور کے وزن پر بولے گا۔ اسی طرح 'مہاں' جو لکھنؤ کے قریب ایک قصبے کا نام ہے۔ گماں کے وزن پر ادا کرے گا نہ طوفان کے وزن پڑھے"

فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ مہاں بروزن گماں کو جو لکھنؤ کے متصل ایک قصبہ ہے وہاں بروزن طوفان کہتے ہیں لیکن اردو اس کے بالکل برعکس ہے۔

انشا۔ "ترجمہ لفظ طفولیت بزبان اہل پورب لڑکئی باشد و در شاہجہاں آبادیاں ہم رواج دارد۔ در مدرسۂ از زبان طالب علماں لڑکائی و از زبان اہل مغلپورہ لڑکاپن مسموع است و بر زبان فصیحاں لڑکپن جاری است" صہ

کیفی۔ "طفولیت کا ترجمہ اہل پورب لڑکئی کرتے ہیں۔ دہلی کے فصحا لڑکپن کہتے ہیں۔ مگر طالب علم لڑکائی اور اہل مغلپورہ لڑکاپن کہتے سنے گئے" صہ

چوں کہ اشاعتِ پورب کے لہجے کی خصوصیت ہے اور لڑکائی لڑکئی کی اشاعتی حالت ہے دھوکا ہوتا ہے کہ جن طلبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ پوربی ہیں۔ انشا نے "در شاہجہاں آبادیاں ہم رواج دارد" کہہ کر جو وضاحت کی تھی اس کو کیفی کے ترجمے نے مبہم بنا دیا ہے

انشا۔ "فصیحانِ اہلِ تحقیق" صـ۹ سطر ۵

کیفی۔ "فصحا اور محققوں کے نزدیک" صـ۷ سطر ۱۳

"فصیحانِ اہلِ تحقیق" اور "فصحا و اہلِ تحقیق" کا فرق اس قدر واضح ہے کہ اس کی طرف توجہ دلانا بدمذاقی ہوگی۔ انشا کے اکثر مباحث کو سمجھنے کے لیے یہ فرق مستحضر ہونا چاہیے۔

"دردانۂ سوم حاوی بر بعضے ذکر فصیحاں" میں انشا نے دو قول نقل کیے ہیں اور دونوں کے جواب دیے ہیں۔

قولِ اول:۔ "کلام شعرا در ہر شہر فصیح تر از کلام دیگراں باشد" صـ۳۲

جواب:۔ اس کے جواب میں پہلے تو میر اور سودا کے کلام سے ایسے لفظ چن کر پیش کیے ہیں جو اردو نہیں اور فصیحوں کی زبان پر نہیں پھر لکھا ہے کہ:۔

"از قولِ اہلِ تحقیق ضعف مذہب کسانیکہ سند لفظ فصیح از کلام شعرا جویند بہ ثبوت پیوست و ایں جواب ہم پسندِ ما است کہ شاعراں فصیح تر زیں آدمیاں اند" صـ۳۳

قولِ دوم:۔ "در بعضے محققاں برآں کہ در شعر اکثر اوقات ضرورت حفظ وزن و رعایت قافیہ مانع فصاحت می گردد۔ بعضے الفاظ را کہ خلاف زبان ایشاں است برائے ضرورت عمداً می آرند نہ از راہ بیخبری" صـ۳۳

جواب:۔ "دلیل بر ضعف جواب ایں کہ شاعراں البتہ زبان شہر خود را خوب میدانند و لفظ بیگانہ نیز عمداً می آرند لیکن مقلد شاں کہ از جائے دیگر باشد چہ می داند کہ شاعر او دانستہ ایں لفظ را کہ در شعر خود آوردہ است زبان اردو

است یا زبان جائے دیگر و عمداً از روئے ضرورت در کلام جائز داشتہ یا بے ضرورت اجتہاد نمودہ بلکہ بیچارہ ہر چہ در شعرش خواہد دید ہمہ را از روئے پاکیزہ خواہد فہمید و با یاران مباحثہ بیجا خواہد کرد و آخر کار پشیمان و خجل خواہد شد " صفحہ ۳۳

حاصل کلام یہ کہ انشا نے زبان دانی کی جو چار شرطیں مقرر کی ہیں۔

(۱) ثبوت والدین شخص از خاک پاک دار الخلافہ۔

(۲) میسر شدن صحبت اردو داناں۔

(۳) شغف ایں کس بہ تحصیل و تحقیق آں۔

(۴) تیزی طبع و وقادت ذہن۔

ان میں سے پہلی، دوسری چوتھی شرطیں سودا میں موجود ہونے کے باوجود تیسری شرط جو واجبات سے ہے مفقود تھی۔ یعنے انشا کے نزدیک سودا فصیح تو تھا لیکن محقق نہیں تھا۔

کیفی نے " فصیحان اہل تحقیق " کو " فصحا اور اہل تحقیق " بنا کر انشا کے کل دلائل باطل کر دئے۔

انشا۔ " چار حرف مشکوک آں دال و خا با نون یکے شدہ و سین با یا یکے گشتہ و جیم فارسی متحد با ہا و نون " صفحہ ۵

کیفی۔ " چار حرف مشکوک ہیں یعنے دال اور خ جو نون کے ساتھ مل کر آواز دے اور سین جو ی کے ساتھ مل کر بولا جائے اور جیم جو ہ کے ساتھ مل کر آواز دے۔ اسی طرح چ جو ہ یا نون کے ساتھ مل کر بولی جائے " صفحہ ۸

تعداد حروف تہجی

نزد عوام و تحقیق ناآشنایان ۹۵

نزد فصیحان اہل تحقیق

۸۵

۱۰ = چار مشکوک + شش محل بحث

(دنیلی، خنجر) ڈ، خ متحد با ن

(سیوداس) ش " " ی

(چھنگلی) چ " " ہ + ن

(زنگار، ثنگرف) ژ، ش متحد با ن

(پوزر، اوس) پ، أ " " " و

(کوبجڑا) ک " و + ن

(مینہ) م " " ی + ن

(۱) ن مخلوط با ا ب پ ت ٹ ج چ خ د ڈ ہر دو مشکوک ڈ ر س ک گ ل م ن ہ،

۱۸ = ۱ + ۱۷

خ د بہ تکلف یکے خ بر ہفدہ ہم زیادہ می تواں کرد

(۲) ہ مخلوط با ب پ ت ٹ ر ڑ د ڈ ک گ ل م ن و ی ج چ

۱۷

(۳) ہ + ن متحد با ک گ ب پ ج چ د و

۸

(۴) ی متحد با ب پ ک گ دھ ڈ ج چ س ش ن

۱۱

۴۵ حروف مخلوط

۳۵ ، تہجی (۲۸ عربی + ۴ فارسی + ۳ ہندی = ۳۵)

۸۹ - ۴ (خنجر، ذنبتی، چھنگلی، سیوداس) = ۸۵ نزد فصیحان اہل تحقیق

۶ محل بحث

۹۵ نزد عوام و تحقیق ناآشنایاں

باتباع تلفظ دلالاں حروف ہندی ہشتاد و ہشت باشد صـ۱۳

جانڑا - زنگار - شنگرف ۳

۸۸

حروف مشتبہ، رہا، ایس، ادس ۳

۹۱ مجموع نزد دیگر حرف می شود صـ۱۳۹

خط کشیدہ عبارت کسی فارسی عبارت کا ترجمہ ہے۔ اس کی رو سے جیم جو ہ کے ساتھ مل کر آواز دے مثلاً جھوٹا اور اسی طرح چ جو ہ یا ں کے ساتھ مل کر بولی جائے مثلاً چھوٹا اور چینگر اور اسی قبیل کے کل مانوس لفظ مشکوک ہو گئے۔

انشا۔ "ملھو پسر وسط اکرم علی خاں و ہر کہ موسوم بایں لفظ باشد" صفحہ

کیفی۔ "ملھو (تین بیٹوں میں بیچ کا بیٹا)۔

انشا کے ہاں ملھو معرفہ ہے۔ کیفی نے اس کو نکرہ قرار دے کر لغت بنا دیا ہے۔ پوری عبارت تک نہیں پڑھی۔

انشا۔ ہ سے مخلوط ہونے والے آٹھ حروف گنانے کے بعد لکھتا ہے کہ :۔

"و دو حرف دیگر با واو یکے شود و آں الف و بائے فارسی است لیکن ہر دو محل بحث۔ ذکر آں بجائے مناسب کتاب کردہ خواہد شد مانند بعضے حروف دیگر کہ در بعضے الفاظ در کتابت معتبر گرفتہ اند و در اصل از شمار حروف بیرون است۔ یا مثل بعضے حروف دیگر کہ مانند سین با یائے گشتہ زبان بعضے بازاریاں باشد مثال حروف اول .... بخشی وغیرہ صفحہ ۹

ظاہر ہے کہ خط کشیدہ عبارت یعنی "زبان بعضے بازاریاں باشد" پر مخلوط حروف کی بحث ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بعد انشا نے "مثال حروف" کے تحت میں بالترتیب عربی اور فارسی کے بتیس ۳۲ حروف تہجی سے شروع ہونے والے اکتیس ۳۱ نام لکھے ہیں۔ ژ سے شروع ہونے والا کوئی نام نہ ملا۔ اس لئے ایک کی کمی ہو گئی۔

کیفی۔ " اور دو حرف وہ ہیں جو واو کے ساتھ مخلوط ہوتے ہیں یعنی الف اور ب۔ لیکن یہ دونوں بحث طلب ہیں۔ جن کا ذکر مناسب موقع پر

کیا جائے گا۔ اور حروف بھی اسی قبیل سے ہیں کہ بعض لفظوں کی کتابت
میں آجاتے ہیں۔ لیکن اصل میں ان کو حروف تہجی کی حیثیت حاصل نہیں
جیسے س، ی کے ساتھ مخلوط ہو کر۔ یہ بعض بازاریوں کی زبان میں آتا ہے
ایسے اور بھی حروف ہیں جیسے ادوا . . . . بخشی وغیرہ"

"ایسے اور بھی حروف ہیں جیسے ادوا الخ" یہ پڑھ کر ہر شخص بعد کے

الکتین[۳] الفاظ میں حروف مخلوط اور ایسے حرف جو حرف کتابت میں معتبر ہیں اور
وہ حرف بازاریوں کی زبان میں آتے ہیں، تلاش کرتے کرتے حیران ہو جائے گا۔
انجمن ترقی اردو کا یہ مقصد کہ اس ترجمے سے فہم مطالب میں آسانی ہو گی فوت ہو گیا۔
انشا۔ "خواجہ محمد لیث کشمیری ہم محبوا است کہ دختر میر محمد مقیم کہ زنش باشندۂ دہلی
است بگیرد" صہ ۱۵

کیفی۔ "خواجہ محمد لیث کشمیری بھی مجبور ہے کہ اس کا نکاح میر محمد مقیم کی بیٹی سے
ہو جو دہلی کی رہنے والی ہے" صہ ۲۳

بیٹی دلی کی رہنے والی نہیں بلکہ اس کی ماں دلی کی رہنے والی ہے۔
انشا۔ "کشادہ در مضاف و مضاف الیہ کو زیادہ کنند۔ بجا بجا یعنی در اردو و
سوائے مضاف الیہ شدن ضمیر متکلم و حاضر میرا بیٹا، تیری بیٹی۔ کا در
ذکر مذکر و کی در ذکر مونث واسطہ سازند مانند میرا کا بیٹا۔ تیری کی
بیٹی۔ و برائے ضمیر غائب کا و کی ضرور تر است۔ چنانچہ اس کا بیٹا اور
اس کی بیٹی گویند و ہمچنیں زید کا بیٹا و عمرو کی بیٹی۔ کشادہ بجائے کا و
کی، کو استعمال کنند مثلاً، اس کو بیٹا۔ اور اس کو بیٹی" صہ ۱۸

مطلب یہ ہے کہ ضمیر متکلم و حاضر میں اضافت کا و کی کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ اس کے عوض را وری آتے ہیں۔ لیکن کشادہ را وری کے ساتھ کا و کی کو بھی واسطہ بناتے ہیں اور ضمیر غائب میں کا و کی کی بجائے کو استعمال کرتے ہیں ۔

اب ترجمہ پڑھیے اور غور فرمایئے کہ اس کا کچھ مطلب بھی ہے ۔

کیفی ۔ " ضمیر متکلم و حاضر کو مضاف الیہ بنانے کے سوا کا یا کی جیسی کہ جنس کی حالت ہو ملانے کا قاعدہ ہے ۔ جیسے میرا بیٹا، تیرا بیٹا اور غائب کے لیے کا اور کی جیسے زید کا بیٹا۔ عمرو کی بیٹی ، مگر یہ لوگ کا اور کی کے بدلے کو استعمال کرتے ہیں ۔ ص ۲۹

انشا ۔ " گاہے حرف متحرک در ثلاثی مجرد ، ساکن نیز گویند " ص ۲۷

یعنے کبھی ثلاثی مجرد لفظ میں متحرک حرف کو ساکن بھی کر دیتے ہیں جیسے حَسَن کو حَسْن ۔ فارسی عبارت میں کچھ تعقید ہو گئی ہے ۔ اگر یوں لکھا ہوتا کہ گاہے در ثلاثی مجرد حرف متحرک را ساکن نیز گویند تو مترجم کو مشکل پیش آتی ۔

کیفی ۔ کبھی متحرک لفظ کو ثلاثی مجرد ساکن میں بھی بولتے ہیں " ص ۲۶

متحرک لفظ کیا ہے اور اس کو ثلاثی مجرد ساکن میں بولنا کیا ہے ؟

انشا ۔ " مفعول مطلق بر چند قسم بود ۔ یکے آں کہ مصدر ہماں فعل کہ مذکور شدہ بیاید ۔

۲ دیگر مترادف مصدر آں مسند دیگر آید ۔

۳ دیگر آں کہ مضاف بسوئے چیزے باشد تشبیہاً ۔

۴ دیگر آں کہ دال بود بر تعدد فعل ۔

۵ دیگر آمدن مصدر بمعنی اسم ساختن کسے لفظے کہ

ازاں مصدر بیروں آید۔
مانند (۱) گانا گایا بے علامت مفعول یا درگانے کو گایا با علامت مفعول ہے مثال اوّل۔
(۲) بولنا، بکی اور بولنے کو بکی مثال دوم۔
(۳) آج میں بھی قاری صاحب کا بیٹھنا بیٹھا مثال سوم ص۱۵۱
کیفی۔(۵) اس معنی میں مصدر کا آنا کہ کسی شخص کو ایسے فعل کا حکم دیا جائے جو اس مصدر سے نکلا ہو جیسے گانا گایا اور گانے کو گایا۔ اب بالترتیب مثالیں دی جاتی ہیں مثال (۱) بولنا، بکی مثال (۲) بولنے کو بکی۔ (۳) آج میں بھی قاری صاحب کا بیٹھنا بیٹھا۔
انشا نے لفظ مانند کے بعد مفعول مطلق کی پہلی قسم کی مثال دی۔ کیفی اس عبارت کو پانچویں قسم کا تسلسل سمجھے، اس صورت میں پہلی قسم کے مفعول مطلق کی مثال غت ربود ہو جاتی تھی اس لیے مفعول مطلق کی جو دو مثالیں ایک مفعول بہ کی علامت کے بغیر (بولنا بکی) اور دوسری علامت کے ساتھ (بولنے کو بکی) دی گئی تھیں۔ ان میں سے پہلی کو مجبوراً پہلی قسم کے مفعول مطلق کی مثال قرار دے دی۔
مترجم کو انشا ضرور معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ایک جملہ کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔
انشا۔ "مثال متعلق بحرف (حرف ربط) در یں جا جمع معطوف علیہ را بے جمع معطوف آید۔ تین خانگیاں اور دو کسبیوں سے آج ملاقات ہوئی" ص۱۶۲
یعنے معطوف علیہ کی جمع معطوف سے علاحدہ یا مختلف آتی ہے اور حرف ربط لفظ

"خانگیاں" پر اثر نہیں کرتا۔

کیفی۔ "مثال حرف کی یہاں معطوف کے علاوہ معطوف علیہ کی بھی جمع آتی ہے۔ جیسے

تین رنڈیاں اور دو ڈومنیوں کا آج مجرا ہوا" صہ ۲۹۳

یہ ترجمہ انشا کی عبارت کا بالکل ضد ہے۔ انشا کہتا ہے کہ حرف ربط صرف معطوف پر اثر کرتا ہے۔ کیفی کہتے ہیں کہ معطوف پر بھی اثر کرتا ہے اور معطوف علیہ پر بھی۔ لیکن خود ہی اپنی طرف سے دی ہوئی مثال میں اس کی مخالفت کی ہے۔ یہ ساری گڑبڑ لفظ "ورائے" کا صحیح ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ہوئی۔

انشا۔ "حرف متحرک ثانی لفظ را در حالت ترخیم نیز ساکن کنند مانند حسنو با سکون سین حسنو کہ صاحبش حسن علی خاں یا حسن بیگ یا حسن علی فقط بودہ متحرک بیماند۔ لیکن در اردو برظاہر کنندۂ فتحہ و رسین می خندند"

خلاصۂ کلام این کہ آدم دانا سوائے ساکن ساختن حرف ثانی منادی بعد ترخیم دیگر چیزہا را قاعدہ کلیہ نہ پندارد و بر ہر چہ مذکور شد اعتراض ہم نکند" صہ ۱۹۵-۶

یعنی ایک اردو دان حسنو کے سین کو ضرور ساکن بولے گا اور اس کے خلاف کسی قاعدے کو نہ مانے گا اور جو کچھ کہا گیا ہے اس پر اعتراض بھی نہیں کرے گا۔

کیفی۔ "دانا لوگ ترخیم کے بعد منادی کے دوسرے حرف کو ساکن کرنے کے سوا باقی چیزوں کو قاعدۂ کلیہ نہیں خیال کرتے اور جو کچھ مذکور ہوا اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔" صہ ۳۵

عجیب منطق اور عجیب دانائی ہے۔

مزید برایں جب کسی عبارت کا مطلب کیفی پر واضح نہیں ہوتا تو وہ اس کو عام طور پر

حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً مرقومۃ الذیل عبارتوں میں سے خط کشیدہ لفظ حذف کر دیئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے اردو ترجمے کے صرف صفحوں کے حوالے دیے دیے ہیں۔

انشا۔ " پروسنا یعنی برآوردن طعام از دیگچہ در رکابی و کردکہ در ہندی ترجمہ لفظ بکنید باشد یعنی بپزید و گیرید...... یعنی گاؤ مادہ" انشا صہ کیفی صہ ۱۶

" بل سبے جمانیری دیتیج پکی بارہ کانے چوٹ کنونڈ سے پھینٹ" انشا صہ کیفی صہ ۱۳

" گاجریں ہیں ادھی کی پاؤ سیر دیچہیں پیسے کے سو لہاں گنڈے ونیز سولہ گنڈ ضعیف یعنی کو ٹریاں دیگر۔ کوڑی کوڑی لے جا یعنی کھنے کی پھانک" انشا صہ ۱۵۶ ۔ کیفی صہ ۲۷

" ڈھنڈورا یعنی منادی ، بندھار یعنی ویرانہ ، چھنگلیا انگشت کوچک صہ " کیفی۔ " ڈھنڈورا ، چھنگلیا " صہ ۱۳

" ڈھنڈھار " کاتبوں کے تصرف سے " بندھار " ہو گیا تھا۔ صحیح لفظ کی زحمت تلاش کون برداشت کرے۔ ترجمے میں یہ لفظ ہی حذف کر دیا۔

انشا نے الفاظ کے جو تلفظ لکھے تھے ، انہیں حذف کر دینے یا صحیح نہ پڑھنے کی وجہ سے ترجمے میں بیسیوں غلطیاں داخل کر دی ہیں۔ اور بعض جگہ اختصار پسندی نے تو فہم مطالب کو ناممکن بنا دیا ہے۔ مثلاً

کیفی	انشا
باوزن راکھنا ، پنکھا کہتے ہیں صہ ۱۱	باوزن راکھنا ، بافتحہ بائے فارسی تشدید کاف

انشا	کیفی
بایائے یکے شدہ والف ص۹	
خوشحال رائے بقاعدۂ ترخیم خوشحالی گرفت	ترخیم کے قاعدے سے خوش حال رائے کو
واز راہ بے علمی خارا با کاف بایائے یکے شدہ	خوش حال کہا۔ لیکن بوجہ بے علمی کے
مضموم وشین را با سین وخارا با یائے	صحت تلفظ پر قادر نہ تھا۔ کھسالی کہہ گیا
مجہول مبدل کرد (کھیسلی) ص۱۱	ص۱۹
لکڑ بتشدید کاف وہائے ہندی	لکڑا۔ کاف مشدد ص۱۹
تاں بھی تو (واو مجہول)، نہ تو (واو معروف)	تاں بھی تو نہ تو ص۲۰
کہ ترجمہ انست باشد بلکہ تو سے ہندی کہ در	عجیب اختصار ہے
عبارت فارسی مقابل آں خود کاف مکسور	
باشد مثلاً من خود میرم کسے برود یا نرود	
ویا من کہ میرم دیگرے برود یا نرود۔ ظاہر است	
کہ ترجمہ عبارت مذکور بہ ہندی غیر ازیں نیست	
کہ میں تو جاتا ہوں کوئی جائے یا نہ جائے ص۱۲	
اگے بالف مفتوح وگاف مشدد ومکسور	آگے (سامنے) ص۲۰
بایائے مجہول بمعنی پیش ص۱۲	
زنگار را زنگال وجنگال و زنگار ہم گویند	...... تینوں صورتوں میں حرف اول
ودر ہر سہ صورت حرف اول جیم باشد یا زا	نون کے ساتھ ایک ہو کر لفظ کو جھنکار کا
با نون یکے شدہ ولفظ مذکور کہ در اصل بر	وزن دیتا ہے ص۲۰

انشا	کیفی
وزن اسباب است بروزن چہار گردد ص۱۳	
زنگار بروزن چہار ص۱۳ سطر ۱۳	زنگار بروزن جہار ص۲۱
" " ص۱۲۹ سطر ۱۶	زنگار چہار کے وزن پر ص۲۲۹
کانٹھ کٹھول بانسلی جھنجھری میرا نانو ص۱۳	کانٹھ کٹھول بانسلی جھنجھری میرا نانو ص۲۱
	گانٹھ کٹھول بانسلی جھنجھری میرا نام ص۱۳۱
والا نود و یکحرف ازیں زبان نشان داده می شد ص۱۲۹	ورنہ اس زبان کے حروف تہجی بانوے شمار میں آئے ص۲۲۹
وحساب نود و یک حرف بایں طریق کہ.... ...مجموع نود و یک حرف می شود ص۱۲۹	بانوے حروف کا حساب اس طرح ہے کہ.. ...... یہ کل ہوئے اکیانوے.... ص۲۲۹
پنہچیا (ن مقدم ہے ہ پر) کہ نقل معنی و ترجمہ رسید بزبان ہندی است پونچھا گویند صحت لفظ مذکور بضمہ باے فارسی با نون یکے شدہ و باے ساکن و جیم فارسی والف باشد ص۱۹	پہنچیا (ہ مقدم ہے نون پر) کو پونچھا کہتے ہیں ص۳۰
طالب علم را طلبۂ علم بسکون لام و فتحہ با و کسرۂ عین و لام و سکون میم یا طالبے علم ہم زبان دارند ص۹۸	طالب علم کو طلبۂ علم یا طالبے علم کہتے ہیں ص۱۱۶
این عمل را بزبان اردو چھٹی گویند با جیم فارسی	جیسے چھٹی کہتے ہیں ص۱۳۲

کیفی	انشا
	بکسر و میم ساکن تاے ہندی و یاے معروف

صفحہ

اور غلط الفاظ کی تو کوئی حد نہیں صرف باب سوم میں جو مصطلحات ذیل پر مشتمل ہے اور اہم بھی ہے سرسری نظر میں حسب ذیل غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔

صحیح	غلط
اندھی نگری چوپٹ راج یا اندھیر نگری چوپٹ راجا۔	اندھیری نگری چوپٹ راج
کالی پیلی ڈلو	کالے پیلے دیو
کھدکی	سھرکی
الو ماخرا	الو واخرا
پڑھ پتھر لکھ لکڑ	پڑھ پتھر لکھ لہڑا
دو گنڈی پتی	دو گنڈی پتی
سو سنار کی ایک لہار کی	سو سنار کی نہ ایک لہار کی
بوریا بدھنا	بوریا باندھنا
بغل گھوڑیے	بغل گھوریے
سپڑ پوا	سپڑ داد
بڑھیا کا کاتا	بڈھیا کا کاتا
بڑکی ماری	برکی ماری

صحیح	غلط
نبختی	ببختی
چرباک	چرپاک
چندیا سے پرے سرک	چنڈیا سے پرے سرک
جوگی کا میت	جوگی کا کے میت
گل جنڈرا	گل جندری
دھندلے کرتی ہے	دھندلی کرتی ہے
قدری کی	قدرے کی
نگہ کی چوڑی	نکہ کی چوڑی

ان چیزوں کے پیش نظر اردو ترجمے کے آخر میں جو صرف دس الفاظ کا غلط نامہ دیا گیا ہے اس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ متوسط درجے کے ادیبوں کو یہ غلط نامہ کتا کیسے مستند ہونے کا کتنا بڑا دھوکا دے رہا ہے ۔

ایک اہم اصلاح   انشا ص۵۲   کیفی ص۹۶

"جان چھلا اور خانم جان اور بیگیا آن اور زنا تی اور دیوانی اور کڑھائی اور بہشت کی قمری اور دودپار اور خاصی پیاری اور یاتن صاحب اور میں داری اور بی جی اور بھی جی اور بنو جان اور گھونگھٹ والی اور پردے والی اور اتے جی اور رہی ہی بمعنی مرد سے تشبیہ بہ زنان در لباس و کلام و حرکات ۔"

انشا ص۵۳ کیفی ص۱۳۴

"اور غ کھانی پن جو بہت مزاج میں غندی بازی سے آگیا ہے ۔"

" اور کراہی پن (زنانہ پن) . . . رنڈی . . . " انشا صفحہ ۵۳ کیفی صفحہ ۹۶

کہ شباہت مرد بہ زناں در لباس و کلام و حرکات

آزاد نے کنہائی کو کراہی تو ضرور پڑھا ہوگا۔ لیکن چوں کہ مصطلحات پر نظر نہیں تھی۔ اس کے معنے سمجھ نہ سکے اور سیاق و سباق کے اعتبار سے " سہدپن " کا لفظ لکھ دیا۔ اس سے انشا کا مطلب خبط ہونے پر بھی غنیمت رہا۔

انجمن ترقی اردو کے فارسی اور اردو نسخوں میں الف کو ہا پر مقدم کیا گیا۔ پھر کراہی کو کلاہی بنا کر دیکھا۔ پھر بھی معماہی رہا۔ اس لئے لکھ دیا کہ

"کراہی پن یا کلاہی پن۔ معلوم نہیں یہ کیا لفظ ہیں لیکن آزاد نے شہد پن کا لفظ لکھ دیا ہے اور اس لفظ کو صاف اڑا گئے ہیں" صفحہ ۵۲

ہندوستان میں فارسی کا نشو و نما

(Persian as developed in India) یعنے ہندوستان میں آ کر فارسی نے کیا ترقی کی اور ہندوستان کے ماحول نے اس کی پختگی اور تکمیل میں کیا اضافہ کیا اس کا خاکہ سطورِ ذیل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آرزو لکھنوی اپنی تصنیف "نظامِ اردو" میں لکھتے ہیں۔

ہندی سے کوئی خاص زبان مراد نہیں بلکہ اس لفظ میں یائے نسبتی ہے جو اندرونِ ملک کی تمام زبانوں کے ان الفاظ کو جو اردو میں مخلوط ہیں ملک ہند کی طرف منسوب کر رہی ہے مثلاً آٹا، بھاشا، خصناً گجراتی۔ منڈا پنجابی، کہیں بنگالی، چورن سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ مگر اردو میں مناسب ملک سے سب ہندی کہے جاتے ہیں۔

یہی حالت فارسی کی ہے جس میں رستم، سہراب وغیرہ ژندی، چلم، چق، قرق، وغیرہ ترکی زبان کے الفاظ پہلے سے مخلوط تھے اور اسی کے حکم میں مانے جاتے تھے، بعد کو عربی الفاظ کے ساتھ آدم سریانی، یوسف عبرانی

اصطرلاب وغیرہ یونانی زبان کے الفاظ آکر شامل ہو گئے مگر
مخلوط فارسی میں کسی زبان کے الفاظ کو کوئی خاص امتیازی
حیثیت حاصل نہ ہوئی سوا الفاظ عربی کے کہ وہ اصلی صورت
میں اس کثرت سے اپنے کو بچا رہے ہیں کہ انہیں بھی اجزائے
حقیقی میں ایک جز مستقل شمار کرنا پڑتا ہے"

مولف برہان دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

محمد حسین متخلص برہان می خواست کہ جمیع لغات فارسی
دہلوی و دری و یونانی و سریانی و رومی و بعضے از لغات عربی
و لغات زند و پاژند و لغات مشترکہ لغات غریبہ متفرقہ را
.... بطریق ایجاز بنویسد"

" دربار ملیہ میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ" کے مصنف محمد عبد الغنی صاحب
جلد اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

ہندوستان میں فارسی زبان کا نشو و نما خصوصاً ہندی
اور مقامی پراکرتوں کے زیر اثر ہوا جیسا کہ ایران میں ترکی عربی
فرانسیسی اور روسی زبانوں نے اس پر اپنا اثر ڈالا ہے اور بات
ہے کہ ہندوستان کی فارسی پر مقامی روزمرے کا اثر ہوا ہو
لیکن کسی مستند فارسی شاعر یا انشا پرداز نے فارسی محاورات
کی سخت پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کرنا نہیں چاہا آخری
دور میں اتنا ضرور ہوا کہ صنائع بدائع اور خیال بندی میں فارسی

نویس الجھ گئے لیکن محاورے کی رعایت نہ چھوٹی "

اوپر کے اقتباسات سے دو نتیجے اخذ ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ فارسی زبان میں یونانی سریانی، رومی، عربی، غرض ان تمام زبانوں کے لفظ آسکتے ہیں جن سے اسے ارتباط رہا اور پھر بھی اس کی ساخت میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا تو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بھی بار پا سکتے ہیں

دوسرے یہ کہ جب ہر ہندوستانی نژاد فارسی دان نے اس کا اقرار کیا ہے کہ میرا مسلک اہل زبان کے مسلمہ اصولوں پر مبنی ہے تو کسی کو بطور خود یہ خیال کر لینے کا اختیار نہیں کہ ہندوستانیوں نے فارسی میں اپنا مسلک علیحدہ بنا لیا تھا۔

سخندان فارس کے دسویں لکچر میں جس کا عنوان ہے " فارسی پر ہندوستان میں آکر کیا رنگ چڑھے " آزاد فرماتے ہیں :-

فارسی جب عربی سے رنگین ہو کر ہندوستان میں آئی تو وہ
ہندی کے ساتھ کس طرح پیش آئی اور ہندی نے اس پر کیا کیا
رنگ چڑھائے اول یہی دیکھو کہ اردو ایک نئی زبان پیدا کر دی
اس سے بڑھ کر خود اپنے سلسلے میں بہت سے ہندی لفظوں
کو جگہ دی " پھر لکھتے ہیں :-

" ہندوستانیو تمہیں تعجب آئے گا جب میں اکثر الفاظ
ایسے سناؤں گا کہ فارسی ہیں مگر زبان فارسی نے ہند میں آکر
پیدا کیے ہیں، تم انھیں فارسی سمجھ کر بولتے ہو اور فارسی
والے ان سے وہ مطلب نہیں لیتے جو تم مراد لیتے ہو "

" اس طرح کے بہت سے لفظ ہیں کہ سلاطین ہند

کے درباروں اور دفتروں میں نکلے اور تمام ہندوستان میں
رواج پاکر یہاں کی تصنیفات میں داخل ہو گئے انھیں ہندوستانی
فارسی کہنا چاہیئے اہل ایران کو خبر بھی نہیں ہے البتہ پڑھا لکھا
چاہیئے کہ جس طرح ان لفظوں سے باخبر ہے اسی طرح ان لفظوں
سے بھی آگاہ رہے جو کہ ایران میں ان کی جگہ بولتے ہیں
تاکہ جب اہل زبان کے جلسے میں بیٹھے تو شرمندہ نہ ہونا پڑے
وہی بولے جو وہ آپس میں بولتے ہیں، کیوں کہ فارسی
وہی ہے جو فارس میں بولیں نہ کہ ہند میں۔"

آزاد کے یہ قول بحث طلب ہیں :-

" فارسی نے اپنے سلسلے میں بہت سے ہندی لفظوں کو
جگہ دی۔"

ہندوستان آنے کے بعد مغلوں اور ایرانیوں کو خالصتاً ہندوستان کی بہت سی ایسی چیزوں اور خیالات سے سابقہ پڑنا ضروری تھا جن کے مترادفات ان کی زبان میں ہو ہی نہیں سکتے، اس طرح توسیعِ زبان کے ضمن میں ہندی الفاظ کے ایک معتدبہ ذخیرے کا فارسی میں داخل ہو جانا ناگزیر ہے سنہ ۱۹۲۱ء کے معارف کے فروری اور مارچ کے سالوں میں "فارسی پر اردو کا اثر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں بڑی قابلیت کے ساتھ ان ہندی الفاظ اور خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جو فارسی میں داخل ہوئے۔ اس میں بابر کی تزک سے جو ترکی میں تھی حسب ذیل گیارہ ہندی لفظ لکھے ہیں۔ اگرچہ ان الفاظ کی کثیر تعداد میر اے غنی وغیرہ صاحبوں نے دی ہے، لیکن جس نکتے پر یہاں بحث ہے اس کے لئے اسی قدر لفظ کافی ہیں،

ہاتھی۔ پان۔ پنکھا۔ جامن، کمرک، کیوڑہ، کیلا، کروندا، چرونجی، گلہری، مور"

ان میں ہاتھی اور پنکھے کے لئے فارسی میں پیل اور بادزن یا بادفرا اور کیلے اور مور کے لئے عربی لفظ موز اور طاؤس موجود ہیں۔ باقی الفاظ میں ان کی ہندی صورت کسی طرح بدلی نہیں جاسکتی کیوں کہ ان خالصاً ہندی الفاظ کے مترادف کسی غیر ہندوستانی زبان میں کیوں ملنے لگے یہ بحث اور ہے کہ بادزن و بادفرکے سے ثقیل لفاظ کے ہوتے بادبرنے پنکھے کا سا ہلکا پھلکا لفظ کیوں استعمال کیا درست اس بحث کی گنجائش نہیں غرض یہی اصول کلیم کے ان اشعار پر بھی صادق آتا ہے جنھیں علامہ شبلی نے شعرالعجم میں نقل کیا ہے۔ ان اشعار میں تنبولیاں، دھوبی، پٹھانی، راجپوت، چنپا، مولسری، گدھل، نیم جتنے لفظ آئے ہیں دھوبی کے لئے فارسی میں گازر کا لفظ موجود ہے لیکن دوسرے الفاظ کے مترادف کہاں سے لائیے گا

اس ضمن میں یہ نکتہ نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ فارسی زبان میں مطالب کی ادائی اور اسالیب بیان کی توسیع کے لئے جیسے غیر زبانوں کے الفاظ ناگزیر تھے ایسے ہی ہندی کے ہیں۔ اور یہ سخت نا انصافی ہے کہ غیر کفو (سامی) کے الفاظ (عبرانی، سریانی، عربی، ترکی) فارسی میں داخل ہوں اور موافق مزاج سمجھے جائیں لیکن اپنے ہی کفو (آریائی) کے لفظ اس میں بار نہ پاسکیں اور اجنبی قرار دئے جائیں۔

ملا محمد فائق نے مخزن الفوائد میں سیبویہ کا قول نقل کیا ہے کہ:-

"اگر تم کو کسی زبان کی اصلیت دریافت کرنی ہو تو اس زبان کے مختلف لفظوں پر نظر کرو اور دیکھو کہ اس زبان میں افعال علامات جزو ضمائر و اسمائے اشارہ کس زبان کے ہیں اور آیا تبدیل ہونے پر بھی وہ زبان اپنے مرکز پر قائم

رہ سکتی ہے یا نہیں "

اس لحاظ سے ہندوستان کے کسی مستند فارسی داں نے فارسی بان کے افعال ضمائر و اسمائے اشارہ میں تصرف نہیں کیا اور نہ کسی نے اس کا دعویٰ کیا کہ ان تصرفات کے باوجود فارسی فارسی رہ سکتی ہے اس کے ثبوت میں وہ سب فرہنگیں موجود ہیں جو ہندوستانیوں نے لکھیں، ان میں انھوں نے اپنے ہر قول کی سند میں اہل زبان ہی کے کلام سے استناد و استشہاد کیا۔ ایرانی ہوں یا ہندوستانی غلطیاں سب سے سرزد ہوں گی اور ایسا نہ ہونا محال ہے۔ اگست و ستمبر سنہ ۱۹۴۱ع کے معارف میں خان آرزو کے مجمع النفائس پر جو مقالہ ہے اس کے مرقوم الذیل جملے اور آرزو کے دو قول اس بارے میں قول فیصل ہیں۔

"چوں از رہ قدرت تصرفات نمایاں در فارسی
نمودہ مردم ولایت کاسہ لیسان آنہا کہ از اہل ہند اند در کلام
ایں بزرگوار سخنہا دارند و تقید در صحت تصرفات صحا۔ قدرتاں
ہند ہیچ سخن ندارد بلکہ قائل آنست " (مجمع النفائس)

"اعتقاد بعض عزیزان آنست کہ الفاظ ہندی در آوردن
نیست .... ایں چیز ہا برائے خاناں و مبتدیاں نقصاں دارد
اہل قدرت و استعداد مختار اند " (مراۃ الاصطلاح)

خان آرزو نے اساتذہ کی موافقت کر کے ان پر اعتراض کر کے ان کے مسلمات پر نقد و جرح کر کے خود اپنی فروگذاشتوں کو واضح کر کے ایرانی شعرا کا جس جس انداز میں مذاق اڑایا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانی ہندیوں کی نظروں سے گر گئے اور

خان آرزو کی اس کوشش نے سوسائٹی کا رنگ بدل دیا
اور یہ بات ثابت کردی کہ ہندوستانی کسی حیثیت سے بھی
کسی طرح ایرانی اہل زبان سے کم نہیں یہ شرف اور امتیاز
صرف خان آرزو کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے علم و کمال کو
اپنے ملک و قوم کی سربلندی کے لئے صرف کیا۔ (جناب
اقبال انصاری)

ہندوستانی معاشرت اور ماحول کا نقشہ کھینچنے کے لئے ہندوستانی الفاظ سے بے نیازی محال ہے یہاں تک کہ مولانا قاسم کاہی جنھیں ہندوستانیوں سے روایتی اور قلبی بغض تھا اور جن کا یہ قول ہے کہ ؎

کاہی تو بلبل چمن آرائے کابلی ٭ زاغ و زغن کہ بہ ہندوستاں روی

ہندوستان آئے اور یہاں کی خاک دامن گیر کے طفیل مزاج میں خاکساری آنے کے بعد کہتے ہیں ؎

آتشیں رویست تا خاکستر چو نیلوفر شدہ ٭ از آتش روے تو خاکستر شدہ

اس ضمن میں امیر خسرو کا غرۃ الکمال والا قول کاہی کی حیثیت کو صاف کر دیتا ہے۔

"لفظ ہندی در پارسی لطیفت آوردن چنداں لطفے
ندارد مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بودہ آوردہ شود"

سکندر لودی کے زمانے میں فارسی کے دفتری زبان بننے اور کایستھوں کی ان میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی کوششوں نے ہندوستان کی فارسی کو فارس کی فارسی سے مختلف بنانا شروع کیا۔ لیکن یہ ترجیحات و اضافے اس قدر حاوی تھے کہ بعد کے کل مستند

نثاروں مثلاً ابوالفضل، بدایونی، فرشتہ وغیرہ اور کل مستند شعرا مثلاً عرفی، ظہوری، صائب، کلیم سب نے انھیں تسلیم کیا اور اپنی تصانیف میں جگہ دی۔

آزاد کا ایک اور قول کہ ہندوستانی فارسی دست پناہ، خوش دامن، روشنائی وغیرہ کی جگہ ایرانی آتشگیر، مادرزن، مرکب وغیرہ کہتے ہیں اور ایرانیوں کو مخاطب کرتے وقت ہمیں یہی لفظ استعمال کرنے چاہئیں محل نظر ہے۔ ایک ہی زبان میں مختلف دبستانوں کے لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق ایک شے کے لئے مختلف نام استعمال کرتے ہیں۔ ہر زبان میں اس کا رواج ہے۔ چنانچہ دبستان دلی کے الفاظ کبھی، بڑ، آک اور ٹلی کی جگہ دبستان لکھنؤ کے لوگ پاری، برگد، مدار، پھٹری وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور زبان کے معاملے میں ان دونوں میں بڑے بڑے اختلافات اور معرکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دلی والے لکھنؤ کی زبان کا تتبع نہ کریں لیکن اردو کے ادیب کو دونوں باتیں معلوم ہونی چاہئیں اور اسے کسی تاویل کے ذریعے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ ایک ہی ملک کے دو شہروں کی بولیوں کو جب اتنا امتیاز حاصل ہے تو ایران اور ہندوستان کی فارسیوں میں ایک سر مو تفاوت کیوں روا نہیں۔ آزاد کے اس جملے میں کہ "فارسی وہی ہے جو فارس میں بولتے ہیں نہ کہ ہند میں" فارسی کی جگہ اردو اور فارس اور ہند کی جگہ دلی اور لکھنؤ کے لفظ پڑھ کر دیکھیں تو اس کی حقیقت کھل جائے گی۔ یعنی "اردو وہی ہے جو دلی میں بولیں نہ کہ لکھنؤ میں۔"

حاصل یہ کہ فارسی غیر ملکی زبان اور اس کو ہندوستان میں رواج دینے والے خود ایرانی، مرز و بوم، آب و ہوا اور ماحول کے اختلافات طبائع اور مذاق میں اختلاف رونما ہوئے اور ان کا اثر زبان پر پڑنا ضروری تھا۔ آسائش کی کثرت اور لوازم زندگی کی بہتات سے طبیعتوں کی لطافتیں، تخیل اور تعقل کے پہلو، نئے نئے نقطے تراشے گئے۔ آسودہ انسان

کبھی جدت طرازیوں سے اکتا تا ہے ایک ہی زبان اور نسل کے دو شخص ہیں ایک ایران میں ہے دوسرا ہندوستان میں، ایرانی کہتا ہے کہ "این عبارت را مرکب بشوئید" ہندوستانی کہتا ہے کہ "این عبارت را بروشنائی بشوئید" ضمائر میں اختلاف نہیں، فعل کا استعمال دونوں کے لئے یکساں، حرف جار اور علامت مفعول دونوں جملوں میں برابر رہ گئے دو اسم جو بنا اصول زبان میں داخل ہیں کسی زبان کی بنیاد ان پر قائم ایک نے سیاہی کے لئے مرکب کا لفظ استعمال کیا دوسرے نے روشنائی کا، اب ایران پرستوں کو یہ کیونکر سمجھائیے کہ سیاہی کی تاریکی میں ویدودل کی روشنائی کا کیا سامان رکھا ہے اور ذوق سلیم کس لفظ پر وجد کرنے لگتا ہے۔

اس سلسلے میں علامہ شبلی کا مضمون "تراجم" جو مقالات شبلی جلد ششم حصہ دوم میں داخل ہے بہت اہم ہے، عربی زبان میں دنیا بھر کے علوم و فنون کے ترجمے ہوئے اور ان مترجمین کا بہترین گروہ قوم کا عیسائی، عربوں کی نظر صرف اس بات پر رہی کہ ان کے گنجینۂ معنی کا سرمایہ کتنا بڑھا، یہ کبھی نہیں دیکھا کہ اس سرمایہ کا انداز بیان شعبۂ لغت یا حماسہ کے مطابق ہے یا نہیں بصرہ کی زبان منطبق تھی۔ محکوم ہونے کے بعد فنا ہونی شروع ہوی، آج وہاں عربی ہی عربی ہے اور اس کو رواج دینے والے خود مصری، ایران میں فارسی کا ڈھانچہ تو باقی رہا لیکن وہ صرف عربی گوشت و پوست اور لباس میں چھپا پایا جاتا ہے مگر ایرانیوں نے عربی پر جو احسان کئے اس کے بوجھ سے وہ کبھی اپنی گردن سیدھی نہیں کر سکتی، لیکن "Arabic as developed in Egypt or persia" سے کبھی کسی نے وہ غلطیاں مراد نہیں لیں جو مصریوں یا ایرانیوں نے عربی میں کیں اور نگ زیب کے زمانے سے جب حکومت کو زوال ہونا شروع ہوا تو ہندوستانیوں کی ناتوانی بھی بڑھتی گئی اور بقول غالب ع

میں آ کے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

محکومیت کے زیر اثر اپنے محاسن تو کیا دیکھ سکتے، لگے اپنے عیوب گنانے۔

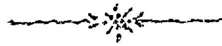
"اکثر غلطیاں جو ہم لوگوں سے گفتگو اور تحریر فارسی میں ہوتی ہیں ان کا سبب یہ ہے کہ ہم کو ان کے ہر قسم کے الفاظ پر اور مناسب مقام محاوروں پر عبور نہیں۔"

اس کے دو علاج ہیں اول اہل زبان کے ساتھ نشست و برخاست دوم ان کے کلام کو پڑھتے رہنا۔"

آزاد کی اس تشخیص اور علاج میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اور انھوں نے فارسی کے اسالیب بیان کی غلطیاں بتائے ہیں جو ہر غیر محتاط ہندوستانی سے فطرتاً سرزد ہوں گی۔ ساڑھے دس صفحے سیاہ کیے ہیں جو تفنن طبع کے طور پر پڑھے جا سکتے ہیں لیکن یہ باتیں لکچر کے عنوان سے کہ "فارسی پر ہندوستان میں آکر کیا رنگ چڑھے" کوئی تعلق نہیں رکھتیں غلطی غلطی ہے خواہ کسی کی ہو۔ اس میں اہل زبان و غیر اہل زبان کی کوئی تخصیص نہیں۔ دنیا کے سب اہل زبان غلطیاں کر چکے ہیں کرتے رہتے ہیں اور کیے جائیں گے۔ عنوان کا تقاضا ہے کہ صرف وہ باتیں بتائی جائیں جن سے فارسی کی سرمایہ داری بڑھی، اس ضمن میں جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس میں فن تاریخ نویسی کا بھی معتد بہ حصہ ہے اس کے علاوہ نثر میں ابو الفضل (ہندی) ظہوری (ایرانی) عالمگیر (ہندی) اپنی طرز کے آپ موجد ہیں شاعری کے میدان میں ہندوستان آکر فارسی نے جو گرم جولانیاں کیں وہ محتاج بیان نہیں ہندوستان میں فارسی کے آخری علم بردار نثر و نظم دونوں میں اپنی طرز کے موجد غالب دہلوی پر خدا کی رحمت ہو کہ انھوں نے فارسی پر خوب رنگ چڑھایا ہے اور ہندوستان میں فارسی کی ساکھ رکھ لی ہے۔ اس مضمون میں زیادہ تر عنوان کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہی ہندوستان میں فارسی کی ترقیوں کی تفصیل بآسانی سے فراہم ہو سکتی ہے۔ ہندوؤں میں فارسی کا آغاز کے عنوان سے ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ صاحب نے اورینٹل کالج میگزین میں جو مضامین لکھے ہیں وہ بہت اچھے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے ذہن میں اس

۱۹۵

عنوان کا جو مفہوم ہے اس کی وضاحت اس مضمون سے ہو جائے گی۔



اکبر الٰہ آبادی اور پردہ

قرآن مجید کی نور کی سورت میں اللہ جل شانہٗ نے مومنات کو صرف اپنا منھ اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے نیچے کھلے رکھنے کی اجازت دی ہے تاکہ چلنے پھرنے اور کاروبار میں دقت نہ ہو اور ان کو گواہ بن کر عدالت میں جانا پڑے تو پہچانی جا سکیں (بقرع ۲۳) لیکن مومن مردوں اور مومن عورتوں دونوں کو فرداً فرداً نیچی نظر اور عفت کی تاکید پر تاکید کی ہے اور کلام پاک میں تین مواقع پر عفت مآب خواتین کی صفت میں قاصرات الطرف نیچی نظر والیاں کا لفظ آیا ہے (صافات ع ۲، رحمٰن ع ۳، ص ع ۴) اور مومن عورت صرف اپنے خاوند، باپ، خسر، بیٹوں، سوتیلے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، بڈھوں، معصوم بچوں اور اپنی عورتوں سے بے تکلف ہو سکتی ہے (نور ع ۴) قرآن مجید بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن مرد کیوں کر جانیں کہ ان میں سے کون خادمائیں ہیں اور کون بیگمیں تاکہ فرق مراتب ملحوظ رہ سکے اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس امتیاز کو بھی بیان کر دیا ہے "اے نبیؐ اپنی بیبیوں اور بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چادریں اوڑھ لیں تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور تکلیف سے محفوظ رہیں" (احزاب ع ۸)

اکبر الٰہ آبادی کا وہ کڑوا کسیلا قطعہ بند جس پہ پٹے کے مخالفوں کو پھریریاں آتی ہیں، ہر اردو دان کو معلوم ہے؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ✣ اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

یہ قطعہ پردے کے متعلق اکبر کے خیالات کا خلاصہ ہے، چند بی بیوں کو بے پردہ دیکھ کر اکبر کو شدت کی غیرت آئی۔ اس غیرت نے ع زمیں سخت ہے آسماں دور ہے کی قسم کے عذر نہیں جمائے، بلکہ اکبر نیرنگیٔ دہر سے اس قدر بیغور رہے کہ انھوں نے زمین میں گڑ جانے کو اس نظارے کے دیکھنے پر ترجیح دی اور سچ مچ معنوی طور پر زمین میں سما گئے لیکن اس غیرت کی نوعیت کیا تھی، قومی یا مذہبی، اکبر نے اس کی تصریح کر دی ہے' ع اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا۔ تو جو عورتیں اکبر کو بے پردہ نظر آئیں ان کی بے پردگی قومی تھی۔ قومی پردے کی خصوصیات اکبر نے خود بیان کی ہیں :-

بٹھائی جائیں گی پردے میں بی بیاں کب تک   بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی،   تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں   سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک
جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس   چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک
شمشیر زن کو اب نئے سانچے میں ڈھالئے   شمشیر کو چھپایئے زن کو نکالئے

یعنی عورتیں پردے کی آڑ میں زنان خانوں کے باہر قدم نہ رکھیں بہت بے پردہ ہوں تو دروازے پر چھوٹی سی چلمن تک آئیں، ریل کے سفر میں دوہری چادریں اپنی نشستوں کے سامنے تان لیں، اور اگر پورے ڈبے پر قبضہ ہے تو اس کی کھڑکیاں بند کر لیں، اپنے منہ تک کھلے نہ رکھیں اور پردے میں یوں چھپی رہیں جیسے نیام میں تلوار لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ پردے کے اسلامی آئین سے اکبر واقف نہ تھے، فرماتے ہیں :-

نہ یہ قید شرعیہ ہے نہ یہ غفلت کا پردا ہے   رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردا ہے

تمھیں دھوکے میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے ‏ ‏ ‏ ادھر سایہ حکومت کا ہے یاں عزت کا پردہ ہے
فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید ‏ ‏ ‏ ہو اگر ضبط نظر کی اور خود داری کی قید
ہاں مگر خود داری و ضبط نظر آساں نہیں ‏ ‏ ‏ منہ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں
تم میں وہ ضبط نظر ان میں وہ خود داری کہاں ‏ ‏ ‏ رعب قومی شان فاتح ہیبت طاری کہاں
پردہ تو ان کا حق ہے نہیں ان پہ جبر کچھ ‏ ‏ ‏ آیا ہے ان پہ وقت یہ سخت امتحان کا
شوخی مغربی کے خریدار ہیں بہت ‏ ‏ ‏ گاہک مگر خدا ہے حیا کی دکان کا

یعنے ہندوستان میں پردے کی جو قیود ہیں وہ شرعی نہیں اس لئے ان کی پابندی ضبط نظر اور خود داری کے ہوتے خواتین پر فرض بھی نہیں، یہ پردہ صرف رواج مصلحت حکمت اور عزت کی بات ہے آخر اس غیر شرعی اور محض رواجی و مصلحتی پردے کو برقرار رکھنے کے لئے اس قدر جدوجہد کیوں: اس کے سیر حاصل دلائل اکبر نے پیش کئے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان تین حیثیتوں سے آئے بعضے صرف تجارت اور سیاحت کے لئے، بعضے صرف تبلیغ و اشاعت کے لئے اور بعضے صرف ملک گیری اور حکمرانی کے لئے پھر یورپ کی قومیں صرف تجارت اور سیاحت کے لئے آنے لگیں اور جب مسلمانوں میں نہ تجارت رہی نہ اشاعت، نہ حکومت تو طوائف الملوکی نے سلطنت کی باگ انگریزوں کے ہاتھ میں تھما دی۔

ہرجائی پن یوں تو مملکت کا بھی برا ہے ہی خصوصاً صنف نازک کی شان اور عصمت کے لئے ہلاہل ہے، فطرت پرست مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں "کامثال اللؤلؤ المکنون" (سورۃ واقعہ) خواتین کی حفاظت کی اردو زبان کا مبالغہ گواہ ہے کہ ان حرم سراؤں میں پرندہ پر نہیں مار سکتا اور ہوا کا گذر نہ ہوتا تھا، اگر کبھی خواتین پردے سے باہر بھی آتیں تو مسلمان تیغ بہ کف تھے، حکومت کا سایہ تھا، رعب قومی تھا، سر کفن باندھ کر گھر سے کر [illegible]

نکلتا ہے جو آنکھیں لڑانا، آج ہم راضی نہیں، رعیت ہیں اور جن کے خون میں غیرت ہے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ پردے کی ضرورت تب زیادہ تھی یا اب زیادہ ہے۔

حفظ عصمت بھی تھی لیکن یہ پردہ ہند میں — مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اس کی ضرورت ہی نہیں — بیشتر ایا مدا تھی سلطنت کی بات تھی
خون میں باقی رہی غیرت تو سمجھے گا کبھی — خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

اکبر کے اس باادب اور سنجیدہ سوال پر کہ "آپ کا پردہ کیا ہوا" چند بے پردہ بی بیوں کا بپھر جانا اور سب کا ایک زبان ہو کر بے ادبی اور گستاخی سے کہنے لگنا کہ "وہ پردہ مردوں کی عقل پر پڑ گیا" آپ کو ضرور کھٹکا ہوگا۔ اکبر کو عورتوں کی فطری حیاداری اور خوش خلقی سے اس منہ پھٹ جواب کی توقع نہیں تھی، پھر بھی انہیں اچنبھا نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بی بیاں بے پردہ ہوئی ہیں وہ اپنی مرضی کے خلاف مجبوراً ہوئی ہیں اور اس جواب کی تلخی میں ان کا انتقام پھوٹ نکلا ہے ان امور کی مزید تصدیق ان اشعار سے ہوتی ہے:

پردہ اٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی — جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک — یہ اگر سچ ہے تو بیشک پیر نابالغ ہیں وہ
پردہ در کی رائے سن کر بی بیاں کہنے لگیں — اب ہمارے وارث ایسے ہیں نگوڑے ہو گئے
پردے کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم — اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے
مذہب کا تو دم وہ بھرتے نہیں پر وہ بحث کیا کرتے ہیں — اسلام کا دعویٰ ایک طرف کافر ادائی ایک طرف
چل بسے وہ جنہیں ہمدرد تھا خودداری کا — نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی امید
دل لیے لے کے نکلنے لگے کالج کے جواں — شرم مشرق کے عدو شیوۂ مغرب کے شہید
ادھر جو الٹی کہے ہے یہ سودا کہ سیر بازار نہیں کرتیں — ادھر خواتین خلوت آرا ہنوز ہستی اپنی توقع میں ہیں

مگر یہ قید حرم کہاں تک چلے کی کب تک نقاب کب تک   کہ گھر نرسا کی لیڈیاں بھی شریک اعدا کی فوج میں ہیں

الرجال قوامون علی النساء (نساء ع ۶) مرد عورتوں کے جو پاسبان ہیں وہ جدھر ان کی رہبری کریں گے یہ ادھر ہی کو چل پڑیں گی، دنیا کی ہر قوم کی عورتیں دینداری اور قدامت پرستی میں ضرب المثل ہیں کیسی قوم کی خصوصیات کو بدلنا مشکل بھی سہی لیکن یقینی طور پر تعلیم ہی بدل سکتی ہے چنانچہ اتحادیوں کا دعویٰ ہے اور مقبول ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعے جرمنوں کی قلب ماہیت کر دیں گے، ہندوستان میں بھی یہی ہوا، پردے کے مخالفوں نے چپ چاپ نئی تعلیم کی داغ بیل ڈال دی،

بقول اکبر :-

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو   پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو
تمہاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں سب برمیں ان پہ شوخی   مری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشم خوباں سے شرم ٹپکے
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی   اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
حجاب تمکنت کو دور کرتا ہے نہ بیڈ سے   سوا اس کے جو باتیں ہیں فقط اک پردہ پوشی ہے
تعلیم لڑکیوں کو ضروری تو ہے مگر   خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
مناسب ہے نئی تعلیم نسواں   یہی رہ آپ اب بے رد و کد لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات   میاں بدلیں تو بی بی کیوں نہ بدلیں
کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں   ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم   قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی   یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اب بمصداق ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے، پردے کے خلاف مناظروں میں طالبات بھی حصہ لینے لگیں، ایک بحث کا کچھ حصہ منقول ہے :-

بحث میں آ ہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب — زہرہ ممبر ہوئیں وہ ڈرتے تھے جناب خورشید
دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب — کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید
شیخ صاحب ہی کا کام ہے بزم میں کیا رعب دینا — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید
نعرۂ تکبیر کے اس پر اٹھے یاروں میں بلند — لڑکیاں بول اٹھیں خود بطریق تائید
جب حکومت نہیں باقی تو یہ تسکر کیسے — کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید
تم نے شلوار کو پتلون سے بدلا اے شیخ — پھر مرے واسطے محروم رہے کیوں حبل ورید
خود تو گٹ پٹ کے لیے جان دیئے دیتے ہو — ہم سے کہتے ہو کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

لیکن اکبر سچ ہیں وہ شاعری میں بھی اپنے فن سے نہیں چوکتے اور کسی بحث کو تشنہ نہیں چھوڑتے، فرماتے ہیں :-

تعلیم یافتہ ہوں اور نیک بخت بھی ہوں — تم سے رہیں ملائم شیطاں سے سخت بھی ہوں
قرآن ہی کرے گا ان بیبیوں کو پیدا — پاکیزہ تخم جب ہوں عمدہ درخت بھی ہوں

اور آخر میں ایسا حکم لگاتے ہیں اور وہ فیصلہ سناتے ہیں کہ نہ اس حکم کا مرافعہ ہے اور نہ اس فیصلے کی اپیل ہے

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں ہیں کچھ قید — بے حجابی جو ہوا اس میں تو قباحت کیا ہے

اکبر کی مخاطب دین دار خواتین ہیں بے دینوں کی بے حجابی کی انھیں پروا کیا ہے۔ رباعی

ہے صاف عیاں حرم سرا کا مطلب — بیگانوں کے واسطے ہے اک حد ادب
ممکن ہو اگر تو اس کو قائم رکھو — عصمت کے نشان ورنہ مٹ گئے سب

میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پردے کے متعلق اکبر کے خیالات یعنی "کلیات اکبر" کا خلاصہ ہے مکررات کو چھوڑ کر اس خلاصہ میں کوئی خیال شاعر کا نہیں چھوٹا تیسرے حصے کے آخر میں ایک

نظم جس کا عنوان ہے "تعلیم نسواں ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے" درج ہے۔
اس نظم میں جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان کے علاوہ کوئی نئی بات تو نہیں پھر
بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ فقط۔



اصلاح زبان اور خواتین

اردو کے سب سے پہلے شاعر ہندوستان میں امیر خسرو اور دکن میں محمد قلی قطب شاہ جہاں باکوئی اور — اور اردو کے سب سے پہلے نثر نویس ہندوستان میں خفقلی ہوں اور دکن میں شیخ عین الدین گنج العلم یا کوئی اور — بہرحال جب سے اردو نظم و نثر لکھی جانے لگیں اس وقت سے لیکر آج سے ۲۵ ۔ ۳۰ سال پہلے تک مسلم خواتین کی دنیا مردوں کی دنیا سے بالکل علاحدہ رہی ہے بعض خاندانوں میں پردے کا اس قدر اہتمام تھا کہ " عورتوں کی پوشاک گھر میں دھوتے تھے یا جلا دیتے تھے، دھوبی کو نہ دیتے تھے کہ نامحرم کے ہاتھوں میں عورتوں کا لباس جائے " اس لیے دنیا کی اور زبانوں کے برخلاف اردو میں عورتوں اور مردوں کی علاحدہ علاحدہ زبانیں بن گئیں ۔ ان دونوں زبانوں کا پہلا اہم فرق یہ ہے کہ مرد اردو لکھتے اور بولتے وقت عربی اور فارسی کے لفظ اور ان کے مرکبات عادتاً یا تکلف سے استعمال کرتے ہیں اور جن مختلف زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے ان زبانوں کے لفظ بھی بے تحاشا بول جاتے ہیں ۔ اس کے برخلاف عورتیں ہمیشہ خالص سادہ صاف اور ستھری زبان بولتی ہیں — دوسرا فرق یہ کہ فطری طور پر عورتوں میں شرم و حیا اور وہم خوف زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ ان احساسات کو ظاہر کرنے والے عام الفاظ کے عوض خاص لفظ بنا لیتی ہیں اور انھیں آپس کی بول چال اور تحریر میں استعمال کرتی ہیں ۔ لیکن جب کسی قوم

کے سربرآوردہ اور ممتاز افراد اپنی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے ترقی کے زینوں سے نیچے اترنے اور پیچھے ہٹنے لگتے ہیں تو اس قوم کی ہر بہتری اور خوبی کو وہ اپنے ساتھ اتار اور ہٹا لاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر اس قوم کے کسی قول و فعل میں وقار سنجیدگی اور متانت باقی نہیں رہتی اور وہ قوم ہر تخریب کو اصلاح اور ہر تاریکی کو روشنی سمجھنے لگتی ہے، چنانچہ جب زمانے میں مغلیہ شاہنشاہی دلی میں اور اس کی وزارت لکھنؤ میں دم توڑ رہی تھی، سعادت یار خاں رنگین اور جرأت اور میر یار علی جن کا تخلص "جان صاحب" تھا ان لوگوں نے اپنی عمریں عورتوں کی خاص بول چال، اصطلاحوں اور محاوروں کے صرف تاریک رخ دکھانے میں صرف کردیں یہاں تک کہ انشاؔ جیسے وحید عصر علامہ کو بھی دربار داری کرنے کے لئے ریختی یعنی وہ نظم جو عورتوں کی بولی میں کہی جائے، کہنی پڑی، لیکن فطرت کا قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی خوبیوں کو لاکھ چھپائیں یا ان کا مذاق اڑانے کی لاکھ کوشش کریں وہ خوبیاں ضرور روشن ہو کر رہیں گی۔ چنانچہ عورتوں کی وہی زبان جو رنگین اور جرأت اور جان صاحب کے یہاں محض کالک ہے، میر انیس کی شاعری میں شمع ایمان اور محبت اہل بیت کی ترجمان ہے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ "میر انیس کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے، ان کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ اور فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میرے گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اس طرح جیسا آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ مشہور ہے کہ فیض آباد میں بہو بیگم صاحبہ والدہ نواب آصف الدولہ کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جس میں ایسے محاورے اور مثلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی تھیں اور اس دفتر کے افسر اعلیٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔" یہ ایک ہی اقتباس اردو ادب میں اس اردو کی جو خواتین بولتی تھیں اہمیت

ثابت کرنے کے لئے کافی ہے وہ جو کہا ہے کہ ہر کارے وہر مردے یعنی ہر شخص ہر کام کا اہل نہیں ہے۔ عورتوں کی زبان کے تقدس کو اجاگر کرنے کا شرف اللہ میر انہیں کی قسمت میں لکھا تھا عورتوں کی زبان کو صحیح رتبے پر پہنچانے میں منشی احمد علی شوق قدوائی نے بھی جاں فشانی کی ہے۔ "مثنویاں آپ کی بہت اعلا درجے کی ہوتی ہیں۔ علی الخصوص "عالم خیال" جس کی زبان نہایت لطیف اور شیریں ہے، بے حد مقبول ہوئی" یہ کتاب ایک ستم رسیدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کی تمام تر شہرت اس لئے ہے کہ انھوں نے اپنی اکثر تصانیف عورتوں کی زبان میں عورتوں کے لئے لکھیں اور اسی کی بدولت صاحب طرز کہلائے۔ ادیبوں کو حیرت ہے کہ "مولانا عورتوں کی خاص زبان اس قدر صحیح اور با محاورہ لکھنے پر کیوں کر قادر ہوئے"؛ مولوی سید احمد دہلوی مصنف "فرہنگ آصفیہ" کی زبان بھی عورتوں ہی کی زبان ہے۔ ان کی بیش تر تصانیف کا دوسرا جزو لفظ نسا ہے۔ مثلاً ہادی النسا، لغات النسا، تحریر النسا، اخلاق النسا، اور ان کی ایک تصنیف علم النسا، میری آج کی اس تقریر سے متعلق آپ جانتی ہیں کہ راشد الخیری مرحوم نے خواتین ہی کی زبان لکھ کر تاریخ ادب میں جگہ لی ہے۔ غزل گوئی میں داغ سطحی بازاری اور رند ہونے کے باوجود ان کی شاعری اور استادی کا سبھی نے اعتراف کیا ہے اور حالی جیسے سخت گیر معلم اخلاق جو خفیف لغزش کے بھی روادار نہیں۔ داغ کی شاعری کے حق میں فرماتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

یہ رواداری کیوں، صرف اس لیے کہ داغ کی زبان عورتوں کی سیدھی سادی، شیریں اور بے ساختہ زبان ہے اور مولوی محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ریختہ کی زبان

کو جو بے حد سراہا ہے تو صرف اس لیے کہ "میر سوز مرحوم کی زبان ٹھیٹ میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے"

اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان کے دو پہلو ہیں ایک لطیف و نازک یہ عورتوں کی زبان ہے اور دوسرا گراں و شان دار یہ مردوں کی زبان ہے یعنی عورتوں کی زبان دودھ ہے اس میں مصطلحات علوم و فنون و مسائل معقولات و منقولات کے چاول اور شکر اور بادام کی ہوائیاں اور چھواروں کے تراشے اور کشمش ڈال کر شیر برنج پکا لیں اور اگر چاہیں تو جیسا کہ اس ریاست میں رواج ہے گرم مسالے میں سے لونگ اور الائچی اور دار چینی گھی میں بھون کر اس کو بگھار لیں۔ اس مرکب کا نام مردوں کی زبان ہے اور اس کے پکانے کا کمال جب ہے کہ ہر شے کا مزا زبان کو علاحدہ علاحدہ محسوس ہو اور اس طرز کو زبان اور علوم کے ماہر ہی نباہ سکتے ہیں۔

یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اب تک اردو میں عورتوں اور مردوں کی زبان کا یہ فرق گھٹتا ہی چلا آرہا ہے۔ میری دانست میں اس کے اہم وجوہ یہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ عورتوں اور مردوں کے نصاب تعلیم میں اول سے آخر تک بالکل کوئی امتیاز نہیں اور آج جتنی شاعرات و مصنفات نظر آتی ہیں وہ کل کی کل چند مستثنیات کے سوا اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم یافتہ ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ ہندوستان کے اکثر مقامات پر عورتوں اور مردوں کی تعلیم مشترک طریقے پر ہوتی ہے اور اس کا رواج بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ اخباروں اور رسالوں میں عورتوں اور مردوں کے مضامین جو برابر شائع ہوتے ہیں وہ تقریباً ایک سے ہوتے ہیں۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ عورتیں خود اپنی زبان کی روایتی خوبیاں برقرار رکھنے کی سعی نہیں کرتیں کیونکہ اگلے وقتوں کی بڑی بوڑھیوں نے جو زبان میراث چھوڑی وہ گھر لیے ہے اور جوان کی

موجودہ دنیا کی ترجمانی کے لئے بالکل مجبور، اور خواتین میں اتنا عزم و استقلال نہیں کہ اس ماہریے میں اضافہ کرکے موجودہ ضروریات زندگی کے مطابق اس کو زندہ رکھ سکیں، شاعروں میں حضرت آرزو اور حضرت جگر کی قبیل کے شعرا اور نثر لکھنے والوں میں آغا حیدر حسن دہلوی اور نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کی قسم کے نثار اردو زبان کی نسائی خصوصیات برقرار رکھنے کی کوشش فرماتے ہیں تو اس کا وہی حال ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست۔ اور کوئی دن جاتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی زبان کا یہ فرق لغتوں اور فرہنگوں میں رہ جائے گا اور دنیا کی عام مقبول زبان انگریزی کی طرح اس میں بھی عورتوں اور مردوں کی گفتگو اور تحریر میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ تاج محل کی خوب صورتی اور نازکی مانی ہوئی ہے۔ لیکن دنیا آج اس فن معماری کو بھول چکی ہے۔ اسی طرح نصف صدی بعد کی خواتین اور مرد، پہلے کے لوگ عورتوں کی زبان میں جو جذبات اور خیالات ادا کر گئے ہیں، انھیں پڑھ پڑھ کر سر دھنیں گے لیکن ویسا نہ کہہ سکیں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج بھی اردو زبان کے تاج محل پر اس قدر روپے اور محنت اور وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے اس کا جواب آپ خود سوچیں۔

یہ تو آپ سن چکیں کہ ہندوستانی خواتین اردو کی مائیں ہیں۔ اب آپ میسوری خواتین غور فرمائیں کہ دنیائے اردو میں آپ کا کیا درجہ ہے۔ جب تک آپ کی زبان معیاری نہیں بنتی، یہاں کے مرد لاکھ سر کھپائیں، عام طور پر اردو میں وہ کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ دس بارہ سال کی عمر تک آپ کے دامن تربیت میں رہ کر جن غلط لہجے، غلط تلفظ اور غلط زبان کی بچوں کو عادت پڑ جاتی ہے بڑی عمر میں ان غلطیوں کا تدارک کرتے کرتے ان کی عمریں کھپ جائیں گی۔ اس ریاست کی خواتین کی اردو

اور اس کے سیکھنے سے بے پروائی اور غفلت کر کے یہاں کے مرد عام طور پر کبھی ہندستانیوں کے دوش بدوش نہیں ہو سکتے۔ پنجاب جس کی مادری زبان پنجابی ہے آج دلّی اور لکھنؤ کے کان کترے اور افسوس ہے کہ میسور جس کی مادری زبان قدیم اردو ہے، آج تک عام طور پر "نے" کا صحیح استعمال بھی نہ کر سکے۔ مدرسے میں استانی صاحبہ کسی بچی سے پوچھتی ہیں، "بیٹا چوہے نے شیر سے کیا کہا اور شیر نے چوہے کو کیوں چھوڑ دیا؟" ماں گھر میں بیٹی سے پوچھتی ہے۔ "چوّا باگ کو کیا بولیا اور باگ چوّے کو کی چھوڑ دیا؟" آپ جانتی ہیں کہ کس کے جملے بچی کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ جب تک پڑھانے والیاں اور پڑھنے والیاں اور ان دونوں کا ماحول پہلے صحیح اردو نہ بولے اور پھر صحیح اردو نہ لکھے، یہاں کی اردو کی ہندستان میں قدر اور ترقی کی امید رکھنا اور ہم پر وحی نازل ہونے کی امید رکھنا دونوں باتیں ایک سی ہیں۔

کوثر پریس (بک ڈپو) معسکر بنگلور

DUE DATE